ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری

(موضوعاتی و فنی جائزہ)

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار:

منیبہ بشیر

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

©

ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری

(موضوعاتی و فنی جائزہ)

مقالہ نگار:

منیبہ بشیر

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

©

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری (موضوعاتی و فنی جائزہ)**

پیش کار: منیبہ بشیر رجسٹریشن نمبر:**1201**-MPhil/Urdu/S**16**

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر نعیم مظہر _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈئر محمد ابراہیم _____

ڈائریکٹر جنرل

_____

تاریخ

اقرار نامہ

میں منیبہ بشیر حلفیہ بیان کرتی ہوں اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم فل اُردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیااور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

منیبہ بشیر

مقالہ نگار

فہرست ابواب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	iii
اقرار نامہ	iv
فہرست ابواب	v
مقالے کا دائرۂ کار	vii
Abstract	viii
مقالے کا مقصد	ix
اظہارِ تشکر	xi
باب اول: اردو میں مکتوب نگاری	۱
(الف) موضوع کا تعارف، اہمیت، تحدید، بیان مسئلہ اور تحقیقی مقاصد	۱
(ب) مکتوب نگاری کا فن	۳
(ج) اردو ادب میں مکتوب نگاری کی روایت	۱۷
(د) ڈاکٹر انور سدید احوال و آثار (اجمالی جائزہ)	۳۸
۔ حوالہ جات	۴۷
باب دوم: ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا تجزیاتی مطالعہ	۵۰
(الف) ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا موضوعاتی مطالعہ	۵۰
(ب) ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا فنی جائزہ	۱۲۱
۔ حوالہ جات	۱۳۸

باب سوم: تقلید غالب اور مکتوبات ڈاکٹر انور سدید ۱۴۷

(الف) ڈاکٹر انور سدید پیش رو غالب ۱۴۷

(ب) ”غالب کے نئے خطوط“ ناقدین کی آرا میں ۱۷۴

۔ حوالہ جات ۱۹۱

باب چہارم: مجموعی جائزہ، نتائج و سفارشات ۱۹۷

۔ نتائج ۲۰۹

۔ سفارشات ۲۱۰

کتابیات ۲۱۱

ضمیمہ جات ۲۱۳

مقالے کا دائرہ کار

میں نے اپنے اس تحقیقی مقالے کو جس کا عنوان ''ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری (موضوعاتی و فنی جائزہ) ہے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول کا موضوع اردو میں مکتوب نگاری ہے۔ جزو الف میں موضوع کا تعارف، اہمیت، بیان مسئلہ، تحدید اور مقاصد تحقیق شامل ہیں اور اس کے علاوہ مکتوب نگاری کا فنی جائزہ، مکتوب نگاری کی روایت اور ڈاکٹر انور سدید کے احوال و آثار کا اجمالی جائزہ شامل ہے۔ مکتوب نگاری کا فنی جائزہ اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مکتوب نگاری کو بطور صنف ادب کے جانچا گیا ہے۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے تو قدیم روایت اور پھر اردو ادب میں مکتوب نگاری کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف مکتوب نگاروں کے اسلوب کو مختصراً زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس بحث کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر انور سدید کے احوال و آثار اور ادب میں ان کے مقام و مرتبے کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

باب دوم میں ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس کے تحت پہلے ان کے موضوعات کو پرکھا گیا جن میں سب سے اہم موضوع ادب ہی ہے اور پھر اس کے تحت ذیلی موضوعات آتے ہیں جن میں مذہب، سیاست، ملکی مسائل اور تعلیمی صورتحال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فنی جائزہ میں ان کے مکتوبات کی فنی نزاکتوں کو دیکھا گیا ہے۔ ان کا اسلوب زیر بحث آیا جو کہ تمثیلی بھی ہے۔ سوالیہ بھی جس میں طنز کی کاٹ بھی ہے اور مزاح کا تڑکا بھی۔ محاورات اور تشبیہات کا استعمال بھی ہے۔

باب سوم جس کا موضوع ''مکتوباتِ انور سدید اور تقلید غالب'' رکھا ہے۔ اس باب میں ہم نے ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات جو انھوں نے اسد اللہ خان غالب کے رنگ اور آہنگ میں لکھے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے اور دیکھا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ اس جائزے کے بعد ہم نے اس باب میں ان تمام ناقدین کی آرا کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے جنھوں نے غالب کے نئے خطوط پر اپنی آرا دی ہیں اور ڈاکٹر انور سدید کو کامیاب یا ناکام ٹھہرایا ہے۔

چوتھا باب مکمل تحقیق کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں مجموعی جائزے کے تحت گزشتہ ابوا میں پیش کی گئی تحقیق کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اپنی تحقیق کے نتائج درج کرنے کے علاوہ تمام تر تحقیق کو مد نظر رکھتے ہوئے سفارشات بھی پیش کی گئی ہیں۔

ABSTRACT

Dr. Anwar Sadded, a well known name In literary world, needs no introduction. He worked in all genres of literature, particular research and criticism. Besides this his services for prose, irony and humor, sketch writing, column writing, short story, poetry, analysis and translation own special appreciations. He is a writer of more than eighty books. Till date, in both India and Pakistan, multiple research papers have been written about him, on university level. In all these articles his personality shines through very brilliantly. But the main gap lies in the analysis of creative and analytical abilities of Dr. Anwar Sadeed from his own point of view, the best way of doing so was through his letter writing. Thoughts and ideologies of any writer of creative person can be located in his writings which pave a way for understanding his personality, but what reaches a reader directly are a writer' letters.

Research on his letter writing has not been carried out yet. My aim is to introduce him as a letter writer and to search for his personality, ideas and creative efforts in his writing research work is not only a novel efforts will fix his position as a letter writer as prose, irony and humor, sketch writing, column writing, short story, poetry, analysis and translation owe special appreciations. He is a writer of more than eighty books. Till date, in both India and Pakistan, multiple research papers have been written about him, on university level. In all these articles his personality shines through very brilliantly. But the main gap lies in the analysis of creative and analytical abilities of Dr. Anwar Sadeed form his own point of view, the best way of doing so was through his letter writing. Thoughts and ideologies of any writer of creative person can be located in his writings which pave a way for understanding his personality, but what researches a reader directly are a writer' letters.

Research on his letter writing has not been carried out yet. My aim is to introduce him as a letter writer and to search for his personality, ideas and creative efforts in his writing. This research work is not only a novel efforts but will fix his position as a letter writer as well.

An in depth analysis, subject based and artistic, was carried out of his letters were to various personalities throughout his life span.

مقالے کا مقصد

ڈاکٹر انور سدید ادب کی دنیا میں ایک نہایت اہم شخصیت ہیں جو کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ تمام اصناف میں انھوں نے کام کیا جن میں تحقیق اور تنقید سر فہرست ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ انشائیہ، طنز و مزاح، خاکہ نگاری، کالم نگاری، افسانہ نگاری، شاعری، تبصرہ نگاری اور تراجم نگاری کی اصناف میں غیر معمولی خدمات بھی سر انجام دی ہیں۔ تقریباً ۸۰ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

اب تک جامعاتی سطح پر انڈیا اور پاکستان دونوں ممالک میں ڈاکٹر انور سدید پر تحقیقی مقالات کافی تعداد میں لکھے جا چکے ہیں۔ جن میں ان کو تابناک حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم ایک پہلو جس کی کمی محسوس کی جا رہی تھی وہ ان کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو خود ڈاکٹر انور سدید کے زاویہ نظر سے دیکھنے کا عمل تھا۔ جس کا بہترین ذریعہ ان کی مکتوب نگاری تھی۔ کسی بھی مصنف یا تخلیقی صلاحیت کے حامل شخص کے افکار و نظریات اس کی تحریروں میں چھپے بیٹھے ہوتے ہیں اور ہم ان کی خوشبو سے نکلنے والے کی شخصیت تک پہنچتے ہیں لیکن ایک چیز جو براہ راست اور بلاواسطہ قاری تک آتی ہے وہ مصنف کے مکاتیب ہی ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکاتیب پر تاحال کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میرا مقصد ان کو بحیثیت مکتوب نگار متعارف کرانا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت، نظریات اور تخلیقی کاوشوں کو ان کے مکتوبات میں تلاش کرنا تھا۔ میرا یہ تحقیقی کام ڈاکٹر انور سدید کے فن مکتوب نگاری پر نہ صرف ایک نیا کام ہو گا بلکہ اس کی روشنی میں ڈاکٹر انور سدید کا ادب میں بطور مکتوب نگار کے تعین بھی ہو جائے گا۔

ادبی زندگی کے آغاز سے رحلت تک لکھے گئے خطوط جو انھوں نے مختلف شخصیات کے نام لکھے ہیں ان کا موضوعاتی جائزہ لیا جائے گا۔ موضوع کے حوالے سے مختلف ادبی شخصیات سے ملاقات کی جائے گی جو معنوں اور نتائج کے حوالے سے مفید اور کارآمد ثابت ہوں گے۔ اس کے علاوہ تمام خاص و عام کتب و رسائل کا مطالعہ کیا جائے گا جن سے ڈاکٹر انور سدید کے مکتوب مل سکیں۔

مختصراً میرے اس تحقیقی کام کا مقصد ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت اور تخلیقی کاوشوں کا سراغ ان کی اپنی ذاتی تحریروں کی مدد سے لگایا جائے جو ان کے مکاتیب کے علاوہ کوئی دوسری تحریر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان مکاتیب کے اندر جس بے تکلفی خلوص نیت اور دیانت داری سے ڈاکٹر انور سدید نے اپنے آپ کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ دوسری تحریروں میں اس کا سراغ ملنا ناممکن ہے۔

جہاں دیگر ماخذات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں وہاں مکتوبات بھی قابل یقین اور مستند حوالہ ہیں۔

اظہارِ تشکُر

میں اپنا سر رب کائنات کی بارگاہ میں انتہاءی عجز وانکسار کے ساتھ جھکاتی ہوں اور اس کا بے پایاں شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے میرے قلم کو طاقت عطا فرمائی۔ میرے خیالات کو اظہار کا پیراہن پہنانے میں مجھ ناچیز کی مدد فرمائی۔ درود سلام محمد عربیؐ کی ذاتِ مقدسہ پر جن کا امتی ہونا اللہ رب العزت کا سب سے بڑا احسان ہے مجھ پر مجھ گناہگار پر۔

اظہار تشکر ان عظیم ہستیوں کے نام کہ جن کو مالک دوجہاں نے اس دنیائے فانی میں عافیت گاہ بنا کر بھیجا کہ جن کو ماں باپ کہا جاتا ہے جن کی شفقتوں اور حرمتوں نے مجھے لفظوں کی حقیقت سے آشنا کروایا جن کی دعائیں ہر اندھیرے میں اجالے کا باعث تھیں اور سب سے بڑھ کر میں اپنے مربی و مشفق نگران ڈاکٹر نعیم مظہر کی دل سے مشکور ہوں جن کی رہنمائی قدم قدم پر میرے شامل حال رہی اور میں اس قابل ہوئی کہ خود کو تفویض کردہ ذمہ داری سے احسن انداز میں عہدہ براہ ہو سکی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی مادرِ علمی شعبہ اردو کی سربراہ ڈاکٹر روبینہ شہناز کی محبتوں کی بھی انتہائی مشکور ہوں جن کا تعاون اور مدد ہر لمحے میرے ساتھ رہا۔ مقتدرہ لائبریری مادرِ شفیق کی مانند مجھ پر مہربان رہی اور وہاں موجود افتخار عارف اور امتیاز صاحب کی راہنمائی اور تعاون ہر لمحہ حاصل رہا۔

یہاں میں ڈاکٹر وزیر آغا کے صاحبزادے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اور ڈاکٹر انور سدید کے صاحبزادے کی بھی انتہائی مشکور ہوں۔ ایڈیٹر اسالیب (سرگودھا) ذوالفقار احسن کا ذکر نہ کرنا بہت بڑی زیادتی ہو گی۔ کیونکہ انھوں نے مواد کی فراہمی میں ہر ممکن مدد فراہم کی۔

پیاری بہنوں ڈاکٹر نوشیبہ بشیر اور قندیل بشیر لاڈلے بھائیوں محمد اویس بشیر اور محمد حماس بشیر کے لیے ڈھیروں پیار اور دعائیں کہ جن کی بدولت میں یہ سب کرنے کے قابل ہوئی۔

ماما کی جان زِمل فاطمہ، ماما کی طاقت محمد حاذق عبران سے معذرت کہ میں اس تحقیق کے دوران ان کو اتنا وقت نہ دے پائی جو ان کا بنتا تھا۔ زِمل فاطمہ اور محمد حاذق عبران کے لیے بے پناہ پیار جو کہ میری کل کائنات ہیں۔

منیبہ بشیر

باب اول

اردو میں مکتوب نگاری

(الف) موضوع کا تعارف، اہمیت، تحدید، بیان مسئلہ، مقاصد تحقیق:

ڈاکٹر انور سدید دنیائے ادب کا ماہر شناور ہیں۔اس تیز و تند دریا کی کون سی لہر ہے جس میں انھوں نے کامیاب تیراکی نہیں کی۔ان کا کام بہت سی جہتوں پر محیط ہے۔انھوں نے متعدد اصناف میں لکھا اور اپنا لوہا منوایا۔ان کی اردو ادب کی تاریخ، تحقیق، تنقید، انشائیہ، طنز ومزاح، خاکہ نگاری، کالم نگاری، سفر نامہ نگاری، شاعری، تبصروں اور ترجمہ نگاری کی اصناف میں غیر معمولی خدمات ہیں۔ڈاکٹر انور سدید متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔تقریباً ۸۰ سے زائد تنقیدی، علمی وادبی کتب لکھ چکے ہیں۔ان میں چند ایک فکر وخیال، اختلافات، اردو ادب کی تحریکیں، اقبال کے کلاسیکی نقوش، افسانے میں دیہات کی پیش کش، انشائیہ اردو ادب میں، نئے ادبی معاشرے، محترم چہرے، اردو ادب کی مختصر تاریخ اور پاکستان میں رسائل کی تاریخ ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خان کے مدارس سے حاصل کی۔سائنس کے طالب علم کی حیثیت سے ایف ایس سی کے لیے اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز محکمہ آب پاشی سے کیا۔انجینئرنگ کا امتحان ڈھاکہ اور ایم اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے درجہ اول میں پاس کیا۔۱۹۷۵ء میں مقالہ اردو ادب کی تحریکیں لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔انور سدید ماہنامہ اوراق اور قومی ڈائجسٹ کے حلقہ ادارت میں بھی شامل ہوئے۔۳ مارچ ۲۰۱۲ء کو ڈاکٹر انور سدید اس جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔

ڈاکٹر انور سدید کا نام جہاں اردو ادب میں بحیثیت محقق، نقاد، کالم نگار، افسانہ نگار اور دیگر بہت سے حوالوں سے لیا جاتا ہے وہیں ان کا ایک اور بہت بڑا حوالہ مکتوب نگاری کا بھی ہے جس کی طرف توجہ بہت کم ہے۔انسان کے شخصی اور ذاتی اظہار کا ذریعہ شاید مکتوب سے بہتر کچھ اور نہ

ہو۔مکتوب میں ذات کے ابلاغ کے ساتھ ساتھ ایک اور بات جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ ان میں تکلفات اور بناوٹ کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے۔یہ نہ صرف زبان دانی کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ اہلِ علم ودانش کے نئے کمالات کا کھوج لگانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوب بھی الگ انداز اور رنگ لیے ہوئے ہیں۔کہیں ان میں آپ بیتی بیان کی گئی ہے۔کہیں ان میں ہم عصر اور قدیم شعرا کا تذکرہ ہے تو کہیں ادب، فنِ شاعری، تاریخ، فلسفہ اور دیگر بے شمار موضوعات پر باتیں ملتی ہیں۔

اہمیت:

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ادب کی دو بنیادی اقسام ہیں۔نظم اور نثر، نثر کی ایک اہم صنف مکتوب نگاری ہے۔ڈاکٹر انور سدید کا نام مکتوب نگاری کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔لیکن ان کے دیگر ادبی حوالے اتنے مضبوط ہیں کہ مکتوب نگاری کی جہت نسبتاً چھپی رہ گئی۔ میرے تحقیقی مقالے کے بعد ڈاکٹر انور سدید کے فنِ مکتوب نگاری پر نہ صرف ایک نیا کام ہو گا بلکہ اس کی روشنی میں ڈاکٹر انور سدید کا ادب میں مقام بطور مکتوب نگار کے تعین بھی ہو جائے گا۔

تحدید:

جیسے کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ ادب میں ڈاکٹر انور سدید کا نام بحیثیت نقاد، محقق، کالم نگار، شاعر، خاکہ نگار، مترجم اور دیگر کئی حوالوں سے لیا جاتا ہے۔لیکن زیرِ نظر مقالے میں صرف اور صرف ان کی مکتوب نگاری کو موضوع بنایا جائے گا اور باقی اصناف کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔

بیان مسئلہ:

ڈاکٹر انور سدید ایک صاحب اسلوب اور رجحان ساز ادیب اور مدیر تھے۔اردو ادب میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ڈاکٹر انور سدید کے خطوط بے شمار موضوعات لیے ہوئے ہیں۔ دوران تحقیق ان موضوعات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔ نیز مکتوب نگاری کے فن کے

معیارات کی روشنی میں انور سدید کے مکاتیب کا جائزہ لیا جائے گا جہاں اس تحقیق سے ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت کے نہاں گوشے سے آشکار ہوں گے وہیں یہ تحقیقی کام مکتوب نگاری کی تفہیم وتحسین اور اس صنف کے تنقیدی سرمائے میں اضافے کا سبب بنے گا۔

مقاصد تحقیق:

مجوزہ تحقیق میں درج ذیل مقاصد پیش نظر ہوں گے:

۱۔ ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری کا موضوعاتی جائزہ لینا۔

۲۔ ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری کا فنی جائزہ لینا۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید کے غیر مطبوعہ مکتوبات کو منظر عام پر لانا۔

(ب) مکتوب نگاری کا فن:

اگر کوئی نقاد یا محقق ادب کی تعریف کرنا چاہے تو یہ ایک مشکل امر ہو گا کیونکہ اس معاملے میں ہر ایک کا نقطہ نظر دوسرے سے الگ ہے اور نہ ہی آج تک کوئی ایسی تعریف ادب کی سامنے آئی جو اپنی جگہ مکمل ہو۔لیکن اس بات سے قطع نظر کہ ادب کیا ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے۔ایک بات جو کہ بالکل واضح ہے وہ یہ ہے کہ جتنے علوم وفنون ہیں ادب واضح طور پر ان تمام علوم سے مختلف ہیں۔ادب کے الفاظ میں گہرائی ملتی ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا لکھنے والے نے الفاظ کو جذبات کی بھٹی سے گزار کر ہمارے گوش گزار کیا ہو۔ڈاکٹر سید عبداللہ ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ادب وہ فن لطیف ہے جس کہ ذریعے ادیب جذبات واحساسات وافکار کو اپنے خاص نفسیاتی وشخصیاتی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ اپنے الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی وخارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی اور تنقید بھی کرتا ہے اور اپنے تخیل اور قوت مخترعہ سے کام لے کر اظہار بیان کے لیے مسرت بخش، حسین اور موثر پیرائے اختیار کرتا

ہے جس سے سامع وقاری کا جذبہ وتخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا
ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا جذبہ اور تخیل متاثر ہوا۔ا

ادب چاہے مغربی ہو یا مشرقی اس میں ہم کو دو طرح کی تقسیم دیکھنے میں ملتی ہے۔ایک وہ ادب ہے جو کسی مصنف، لکھاری یا ادیب کے اپنے احساسات اور جذبات پر مبنی ہوتا ہے اور دوسرا ادب وہ ہے جس میں کسی دوسرے شخص کے لکھے ہوئے پر تنقید یا تحقیق کی جاتی ہے۔

ناقدین ادب کی نظر میں ادب کی دو اقسام ہیں ایک معلوماتی ادب اس میں لغت، تاریخ، سائنس کی کتابیں شامل ہیں اور دوسرا تاثراتی ادب میں نظم ونثر وغیرہ شامل ہیں۔یعنی بنیادی طور پر ادب کو نظم اور نثر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نظم کے اندر غزل، نظم، مثنوی، رباعی، قصیدہ، مرثیہ، واسوخت، شہر آشوب، منظوم ڈرامہ، سانٹ اور دوہا وغیرہ شامل ہے۔دوسری قسم نثر ہے اس میں داستان، کہانی، ناول، ڈرامہ، افسانہ، انشائیہ، مضمون اور مکتوب نویسی وغیرہ شامل ہیں۔

تمام اصناف اپنی جگہ ضروری اور قابل اہمیت ہیں لیکن یہاں پر ہماری گفتگو کا موضوع اس مقالہ کے عنوان کے مطابق مکتوب نگاری کے گرد گھومے گا۔

اردو زبان چوں کہ مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے یا ملغوبہ ہے۔اس لیے اس زبان میں رائج بہت سارے لفظ دوسری زبانوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔جب ہمارے سامنے لفظ ”مکتوب نگاری“ آتا ہے تو یہاں بھی یہی صورت حال درپیش ہے مکتوب نگاری کا لفظ بھی اردو زبان نے دو زبانوں سے مستعار لیا ہے۔مکتوب نگاری دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔جن میں لفظ اول یعنی مکتوب عربی زبان کا لفظ ہے اور اس سے مراد خط، تحریر یا نوشتہ لیا جاتا ہے دوسرا لفظ جو کہ نگاری ہے یہ اردو نے فارسی زبان سے اخذ کیا ہے۔یوں جب یہ دونوں لفظ ملائے جائیں تو ان سے مراد خط لکھنا یا تحریر کرنا ہے۔مکتوبات کو آسان اور عام فہم زبان میں خط کہا جاتا ہے۔انسان ایک معاشرتی حیوان ہے وہ اس معاشرے میں تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔لہٰذا اس کے لیے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنے اردگرد سے رابطہ قائم رکھے جب یہ رابطہ روبرو ممکن نہ ہو تو اس کے لیے انسان خطوط کا سہارا لیتا ہے۔ڈاکٹر شاداب تبسم لکھتے ہیں:

دو اشخاص کے درمیان گفتگو ایک سماجی ضرورت ہے۔ اور جب یہ عمل روبرو ممکن نہ ہو تو ہم اپنے خیالات کا اظہار تحریر کے ذریعے یعنی لکھ کر کرتے ہیں۔ یہ تحریر خط کہلاتی ہے۔ خط نگاری تحریری شکل میں باتیں کرنا ہے۔ اس لیے خط کو عرفِ عام میں سیدھی ملاقات بھی کہا جاتا ہے۔ ۲

خط کے اگر لفظی مطلب دیکھے جائیں تو فیروز اللغات میں خط کے حسب ذیل معنی مترادفات ملتے ہیں:

۱۔ تحریر، ۲۔ لکیر لائن، ۳۔ نامہ۔ چھٹی، ۴۔ اندازِ تحریر ۳

جب بھی انسان اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو کسی ایسے شخص تک منتقل کرنا چاہے جو کہ اس کے پاس موجود نہ ہو تب وہ ان تمام خیالات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتا ہے یہ تمام تحریری عمل مکتوب نگاری کہلاتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

خط تہذیب انسانی کے محیر العقول عجائبات میں سے ہے۔ انسان کی یہ اختراع اس کی زندگی کے عجیب اور ہمہ گیر تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ پہلے محض سادہ صورتوں کو پورا کرنے کی حد تک ہی محدود رہی اس کے بعد جملہ فنون عالیہ کی طرح ایک فن لطیف۔ بلکہ بقولِ بعض لطیف ترین فن بن گئی۔ ۴

مکتوب نویسی ایک ایسا عمل ہے جو کہ تنہا انجام نہیں دیا جا سکتا اس کے لیے بہت سے لوگوں کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ ایک وہ شخص جو مکتوب لکھنے والا یعنی کہ مکتوب نگار اور ایک وہ شخص جو اس مکتوب کو لے کر جائے اس کو قاصد کہہ سکتے ہیں۔ مکتوب نویسی انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے لہٰذا کوئی بھی انسان تنہا اپنے معاشرے سے کٹ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ دوسرے انسانوں کا محتاج ہے لہٰذا وہ انسانوں سے رابطے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ ان میں ایک طریقہ مکتوب نویسی بھی ہے یعنی اس تمام عمل میں پیغام رسانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

خط نے انسان کے لیے فاصلے کا مسئلہ حل کر دیا اور ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ابھار کی تسخیر کے جو کمالات انسان نے بعد میں دکھائے ان کا پہلا اور اہم قدم یہی واقعہ ایجاد خط تھا۔ گویا دوری کا احساس یا مجبوری ایک اہم چیز ہے۔ جس نے انسان کو گفتگو کے ابہام وایہام اور اس کے شکوک وشبہات، اس تحریف و مسخ اور اس کے ناقابل اعتماد ذرائع اظہار سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو زبانی ابلاغ ابدالآباد تک نارساہی رہتا اور مکالمات کو مشکوک وضعیف ہی رکھتا۔ دیکھئے غالب کے محبوب نے بھی جس شے کو ہراس انگیز اور مشکوک بنانا تھا اس کو قاصد کی زبان کے حوالے کر دیا۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بہر
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے(۵)

اس تمام گفتگو سے جو اہم چیز سامنے آتی ہے وہ یہ بھی ہے کہ مکتوبات ایک طرح سے سند بھی مانے جاتے ہیں اس سے دوسروں کی کہی ہوئی بات محفوظ بھی ہوتی ہے اور حوالے کے طور پر بھی کام میں لائی جا سکتی ہے۔

اگر مکتوب کی وسعت کا اندازہ لگانا ہو تو یہ بات دیکھی جائے ہر عام وخاص کو اس کی ضرورت درپیش آتی ہے۔ کوئی شخص جو کہ کھیتوں میں کام کرتا ہو ہل چلاتا ہو اس کو بھی مکتوب کی ضرورت درپیش ہے۔ اس طرح اگر کوئی شخص شہر میں کسی بڑے آفس میں بیٹھا ہو تو اس کے لیے بھی مکتوب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مکتوب نگاری ایک بہت وسیع عمل ہے جس کی نہ صرف عوام کو ضرورت ہے بلکہ انبیاء علیہ السلام نے بھی اس ذریعے کو استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے مکتوبات کا سہارا لیا جس طرح حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس کو مکتوب لکھا اور اس کا حوالہ قرآن میں بھی ملتا ہے۔ اسی طرح حضرت محمدؐ نے مختلف فرمان سلطنت کے نام بھی مکتوبات میں لکھے۔

عورتیں بھی آپس میں اہم معاملات حل کرنے کے لیے مکتوب کا سہارا لیتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

یہ انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ہو گا جس کو کبھی خط لکھنے یا لکھوانے کی ضرورت پیش نہ آئی ہو۔خط سے بڑھ کر کوئی ادارہ جمہوری یا بنیادی طور پر اجتماعی نہیں ہو سکتا۔ اس ادارے کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ یہ محض ایک عام کاروباری پیغامی تحریر سے لے کر ادب عالیہ کے مرتبے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ عام بھی ہے اور خاص بھی ہے کہ

میان عاشق و معشوق رمز سیت
کراماً کاتبین رایم خبر یست [۶]

اس بات سے جو ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ خط جتنا عام ہے اس سے کہیں زیادہ خاص بھی ہے۔ مکتوب شاید ہر شخص لکھ سکتا ہے لیکن زندہ وجاوید وہی خطوط رہتے ہیں جن کے الفاظ سے سچ جھلکے جن کے الفاظ اپنے لکھنے والے کی زبان ہوں جو اس کے خیالات اور جذبات کی یوں عکاسی کر پائیں کہ گویا لکھنے والا بول رہا ہو۔ مکتوب لکھنے کا سلیقہ ہر کسی کو نہیں ہوتا لیکن جس میں یہ سلیقہ آجائے وہ اپنے مکتوبات کے ذریعے سے پہچانا جاتا ہے۔اس کے لفظ اس کی سیرت کے عکاس بن جاتے ہیں۔ مکتوبات میں کاتب کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سے بات کرتے کرتے اپنے آپ سے خود کلامی کرنے لگ جاتا ہے جو کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ اس کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتا چلا جاتا ہے۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ مکتوب کاغذ پر نہیں بلکہ اپنے دل کے ٹکڑوں پر لکھتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر لکھنے والا حجاج بن یوسف ہو تو اس کا مکتوب اس کی بہادری اور جاہ وجلال دونوں کی زبان بن جائے گا۔اس طرح اگر مکتوب علامہ اقبال کے قلم سے نکلے تو وہ شعر وفلسفے کی چادر اوڑھ لے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

کسی مکتوب نگار کے خطوط اس کے میلانات اور رجحانات، پسند وناپسند،عادات واخلاق، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں، ذہنی وقلبی احساسات اور اس کی شخصیت کی مختلف سطحوں کو قارئین کے سامنے لاتے ہیں۔ خطوط میں مکتوب نگار کی سیرت وشخصیت کے وہ گوشے بھی بے نقاب ہوتے ہیں جو بالعموم عام

> نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یہ لکھنے والے کے ذاتی خیالات وعقائد کے علاوہ اس کے دل کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور اس طرح دل کا معاملہ کھل جاتا ہے۔ علمی اعتبار سے کسی شخصیت کے خطوط کا ذخیرہ اس کی سیرت وسوانح نگاری کا بہترین ماخذ ہے۔ کیونکہ خطوط کی حیثیت آپ بیتی کی سی ہے۔[۷]

مکتوبات کے سلسلے میں جو ایک مشکل دیکھنے میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ مکتوب نویسی ایک ایسا فن ہے جس میں ہر ایک آسانی سے اپنے جذبات کی ترسیل نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس کے الفاظ اس کے جذبات کے عکاس بھی ہوں۔ گفتگو کے دوران انسان کی آواز، لہجہ، جسمانی حرکات وسکنات اس کی خامیوں کی چھپاتی ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بہت عام سی بات بھی اثر کر جاتی ہے اور بات کرنے سے ادا ہوتے ہی سننے والے کے دل پر اثر کر جاتی ہے۔ اگر مکتوبات کو ادب کے ایک شعبے یا صنف کے طورپر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مکتوب نگاری اگرچہ خود ادب نہیں ہے لیکن اگر اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد، ایک خاص آن کوئی خاص لمحہ اور خاص لکھنے والا ہاتھ میسر آجائے تو پھر مکتوبات ادب کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں اور پھر یہ نثر کی صنف بن جاتا ہے۔

لیکن یہ کوئی آسان بات نہیں ہر مکتوب آسانی سے ادب میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے خون جگر چاہیے ہوتا ہے۔ یہ ایک نازک ترین صنف ہے۔ اس فن میں کامیاب وہ ہی شخص ہو سکتا ہے جو کہ قدرت کی طرف سے یہ فن یہ عطیہ لے کر آیا ہو۔ غالب نے خطوط جو کہ بظاہر عام فہم معلوم ہوتے ہیں لیکن غالب کی طرح لکھنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ غالب کی ڈگر کسی اور کے لیے نہیں ہے۔

سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> مگر خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے۔ یہ شیشہ گری ہے اور پھر آئینہ ساز ہو کر بھی کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو سچ مچ ایسا آئینہ ڈھال سکتے ہوں گے جس کے جلوے خود تقاضائے نگاہ بن جائیں اور بہر نظارہ اپنے جوہر کی ہر ادبی لکیر کو مژگاں بنا دیں۔

جلوہ از بس کے تقاضائے نگہ کرتا ہے

جو ہر آئینہ بھی چاہے مژگاں ہونا

غرض یہ کہ خط نگاری اصلاً فنِ لطیف نہ بھی ہو تب بھی بعض اوقات لطیف بلکہ لطیف ترین فن کے درجہ اعلیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔۸

مکتوب نگاری چوں کہ ادب کے اندر ایک مستقل صنف کا درجہ رکھتی ہے۔لہٰذا اس کے لیے اہل زبان نے کچھ اصول وضوابط مقرر کیے ہیں اور ایک اچھے مکتوب نگار پر یہ لازم ہے کہ اس کا مکتوب ان شرائط وضوابط پر پورا اترے۔ مکتوب نگاری کے سلسلے میں سب سے پہلی اور اہم چیز جو ایک مکتوب نگار کے پیش نظر رہنی چاہیے۔وہ ان مقاصد کا اصول ہے جن کے پیش نظر وہ مکتوب تحریر کیا گیا ہے۔مکتوب اس حد تک واضح ہو کہ اس سے مکتوب نگار کا مطمع نظر واضح ہو جائے اور قاری کو معلوم ہو جائے کہ لکھنے والا اسے کیا کہنا چاہتا ہے۔ دوسری اہم بات جو ایک مکتوب نگار کے پیش نظر ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ قاری اس کے مکتوب میں دلچسپی لے۔ایسا نہ ہو کہ پڑھنے والا اکتاہٹ کا شکار ہو جائے۔مکتوب لازمی قاری کے لیے دلی خوشی کا باعث ہونا چاہیے۔ مکتوب کی ایک اہم شرط اس کا ذاتی اور نجی ہونا ہے۔مکتوب لکھتے وقت اس میں ذاتی اور نجی نوعیت کے معاملات زیر بحث لانے چاہئیں۔یہ مکتوب کی کامیابی کی اہم ضمانت ہے۔دراصل ایک کامیاب مکتوب نگار اپنی ذاتی زندگی کے واقعات کو بھی اس طرح زیر بحث لاتا ہے کہ ان واقعات میں ہمہ گیریت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی ہمہ گیریت ایک کامیاب مکتوب کی ضمانت ہے۔ مکتوب کے واقعات میں ترتیب ہو ہر واقعہ دوسرے سے مربوط ہو بات سے بات نکلنی چاہیے۔مکتوب کو بہت طویل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ سید عبداللہ طوالت کو مکتوب کی خامی گردانتے ہیں اور اس سے اجتناب کا مشورہ دیتے ہیں۔اختصار دراصل مکتوب کا حسن ہے اور یہ حسن قائم ہی رہنا چاہیے کیونکہ جس طرح طویل غزل اپنا حسن اور دلچسپی ختم کر دیتی ہے۔ویسے ہی طویل مکتوب، طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔

ادب چونکہ ادیب کی ذات کا عکس ہوتا ہے۔اسی طرح مکتوب کاتب کی شخصیت کا اظہار ہے۔اہل زبان اس کو ''آدھی ملاقات'' کا درجہ دیتے ہیں۔گویا مکتوب نگار کو یوں لکھنا چاہیے کہ

اس کا مخاطب سامنے بیٹھا ہے اور پڑھنے والے کو بھی محسوس ہو کہ لکھنے والا سامنے مجسم حالت میں موجود ہے۔اس طرح کی شائستگی، بے ساختگی، شگفتگی اور دوستانہ پن ہو کہ مکتوب نگار کی ذات کا آئینہ بن جائے۔یہاں پر غلام رسول مہر کے الفاظ بہت بر محل محسوس ہوتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> مکاتیب کاسب سے بڑا فائدہ میرے نزدیک یہ ہے کہ مکتوب نگار اپنے جذبات وامیال، احساسات وتاثرات رجحانات ومرغوبات اور فکر ونظر کے تمام پہلو بے تکلف آشکار کر دیتا ہے۔ہم جس طرح کسی آدمی کی زندگی کا حقیقی نقشہ مکاتیب میں دیکھ سکتے ہیں۔کسی دوسری چیز میں نہیں دیکھ سکتے۔۹

کامیاب مکتوبات وہی ہیں جن میں لکھنے والے کی شخصیت بے لاگ اور بے تکلف انداز میں جھلکنے اور نہاں گوشوں کو سامنے لانے میں مددگار ثابت ہوں۔وہ مکتوبات جو محتاط انداز سے لکھے جاتے ہیں کبھی بھی مقبولیت حاصل نہیں کر پاتے۔

ادب کی ہر صنف ہی اپنی جگہ اہم ہے ہر صنف کی اپنی دلکشی، نشیب وفراز اور نت نئ منزلوں کی عکاس ہے۔لیکن اس کے باوجود جو اثر آفرینی، دلکشی، رنگا رنگی مکتوبات کی دنیا میں ہے۔باقی تمام اصناف اس سے محروم ہیں۔

مکاتیب ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے مکتوب لکھنے والا اپنی تنہائی کو محفل میں تبدیل کر لیتا ہے۔ہجر اس کے لیے وصال کے مزے لاتا ہے۔مکتوبات زندگی کی حرکت اور حرارت کے آئینہ دار ہیں۔مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے لحاظ سے محمد طفیل لکھتے ہیں:

> خط کا فن ایک شخصی فن ہونے کے علاوہ شخصیتوں کا فن بھی ہے۔آسان ترین فن۔۔۔ نازک ترین فن بھی ہے۔اس میں فنی نزاکتوں کی نمود کچھ اس طرح کی مشکل شے ہے جیسے کوئی شے عدم سے وجود حاصل کرتی ہے۔غرض یہ کہ خط نگاری اصلاً فن لطیف بلکہ لطیف ترین فن ہے۔جن خطوط کی انسانی یا سوشل اپیل کامیاب ہو گی وہی خط زیادہ مقبول اور مستقل طور پر دلچسپ ہوں گے۔۱۰

یوں تو مکتوبات کی بہت سی اقسام ہیں تاہم ان کو بنیادی طور پر چھے اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

پہلی قسم شخصی مکتوبات کی ہے۔اگر آپ اپنے استاد گرامی، والد محترم، والدہ محترمہ، بھائی، بہن یا کسی دوسرے رشتہ دار دوست یا اجنبی کے نام خط لکھیں تو اس کی نوعیت سراسر ذاتی، نجی یا غیر رسمی ہو گی ان خطوط کی اہمیت اگر دیکھی جائے تو علمی وادبی اعتبار سے بہت زیادہ ہو گی۔ بالعموم یہ مکتوبات سادہ اور عام فہم زبان میں تحریر کیے جاتے ہیں۔یہ کسی تمہید اور واسطے کے بغیر لکھے جاتے ہیں۔

دوسری قسم عمومی مکتوبات کی ہے۔یہ مکتوبات اگرچہ کسی شخص کو ہی لکھے جاتے ہیں۔مگر ان کا موضوع ذاتی نہیں ہوتا بلکہ یہ مکتوبات کسی بھی اجتماعی ملکی یا معاشرتی مسئلے کے پیش نظر لکھے جاتے ہیں۔زیادہ تر یہ مکتوبات اخبارات یا رسائل میں ایڈیٹر کے نام لکھے جاتے ہیں۔اس میں مخاطب کوئی خاص شخص نہیں بلکہ سارا معاشرہ ہوتا ہے۔

تیسری قسم رسمی خطوط کی ہے جو کسی تقریب مثال کے طور پر شادی بیاہ یا کسی بھی علمی، ادبی، معاشرتی یا سیاسی تقریبات میں شرکت کے لیے مدعوین کے نام لکھے جاتے ہیں۔ان کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہوتا ہے۔

کاروباری مکتوبات کا تعلق اداروں، فرقوں، کارخانوں، دکانداروں وغیرہ سے ہوتا ہے۔

عرضی یا درخواست بھی مکتوبات کی اقسام میں سے ایک قسم تسلیم کی جاتی ہے۔اس کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں جیسے آپ اپنے تعلیمی اداروں کے پرنسپل حضرات کے نام رخصت کے لیے فیس معافی کے لیے یا فیس میں کمی کے لیے درخواست وغیرہ لکھتے ہیں۔عرضی کسی بھی اعلیٰ افسر یا ذمہ دار شخصیت کے نام لکھی جاتی ہے۔اس میں درخواست گزار کے لیے لازم ہو گا کہ وہ ادب کی حد میں رہتے ہوئے اپنی عرضی تحریر کرے۔

مکتوبات کی آخری قسم سرکاری ہے۔اس میں حکومتیں آپس میں گفت وشنید مکتوبات کے ذریعے کرتی ہیں۔سرکاری مکتوبات میں دفتر یا شعبے کا نام لکھا جاتا ہے۔حوالہ نمبر اور تاریخ درج کی

جاتی ہے۔مکتوب الیہ یا اس محکمہ کا نام جس کو مکتوب لکھا جا رہا ہو۔مکتوب کا موضوع وغیرہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مکتوبات کی یہ تقسیم قطعی اور حتمی نہیں ہے۔ ایک مکتوب ایک ہی وقت میں رسمی بھی ہو سکتا ہے اور شخصی بھی۔ڈاکٹر سید عبداللہ مکتوبات کی اقسام کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> خط وکتابت کی بیسویں اقسام ہیں مثلاً: سیاسی، دفتری، تجارتی، کاروباری، عام معمولی، اطلاعاتی، علمی اور معلوماتی، شخصی، جذباتی، خیالی وغیرہ۔۱۱

جس طرح مکتوبات کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے اس طرح ایک مکتوب بہت سے حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مکتوب کے آغاز میں پتہ اور تاریخ درج کی جاتی ہے۔ اس کے بعد القاب وآداب صفحے کے وسط میں یا ایک طرف درج کیے جاتے ہیں۔القاب کی نوعیت کا انحصار مکتوب نویس اور مکتوب الیہ کے تعلق پر ہوتا ہے۔مثال کے طور پر بزرگوں اور بڑوں کے لیے مکرم، محترم، محترمہ وغیرہ اور چھوٹوں کے لیے عزیزمی، عزیزم اور برخوردار وغیرہ۔القاب کے ساتھ سلام دعا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد خط کا مضمون شروع کیا جاتا ہے۔آغاز عموماً رسمی جملوں سے ہوتا ہے۔پھر اصل مضمون یا مدعا بیان کیا جاتا ہے۔

مکتوب کو اچانک ختم نہیں کیا جاتا بلکہ اختتامی کلمات کے ساتھ ختم کرنا زیادہ مناسب ہے۔ خاتمے کے بعد مکتوب الیہ کے مقام ومرتبے کے مطابق آپ کا تابع فرماں، مخلص، نیاز مند یا کوئی بھی مناسب لفظ لکھا جاتا ہے۔آخر میں مکتوب نویس اپنے دستخط کرتا ہے اور کچھ لوگ ساتھ میں تاریخ بھی درج کر دیتے ہیں۔

(ج)مکتوب نویسی کی روایت: اجمالی جائزہ

اگر اس بات کا کھوج لگایا جائے کہ پہلا مکتوب کس نے اور کس کے نام لکھا تو یہ ایک مشکل امر ہے لیکن ایک اندازے کے مطابق مکتوب نویسی کا آغاز تب سے ہو گیا تھا جب نبی نوع انسان نے لکھنے کا آغاز کیا۔ قرآن کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ کا پیغام اس کی مخلوق تک پہنچانے کے لیے بھی مکتوبات کا سہارا لیا۔ملکہ بلقیس کے نام حضرت

سلیمانؑ کا مکتوب اس بات کا ثبوت ہے کہ مکتوب نویسی نے ہزاروں سال پہلے جنم لیا تھا۔ قرآن پاک میں آیت مبارکہ ہے جس کا ترجمہ یوں ہے:

> میرا یہ خط لے جا اور اسے ان کی طرف ڈال دے پھر ان سے ہٹ کر بیٹھ جا سو دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ بلقیس نے کہا اے سردارو! بلاشبہ میری طرف ایک گرامی نامہ ڈالا گیا ہے۔ بے شک وہ سلیمانؑ کی طرف سے ہے۔ اور بے شک اس کا آغاز اللہ کے نام سے ہے جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔ ۱۲

ایک تحقیق کے مطابق مکتوب نگاری کا آغاز روم میں ہوتا ہے۔ سرے کی مکاتیب کے اندر ہمیں روم کی معاشرت اور رہن سہن کے متعلق معلومات میسر آتی ہیں۔ لیکن ان مکاتیب کے مطالعہ سے جو بات سامنے آتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومیوں کے انداز تحریر میں سادگی مفقود تھی۔ بلاغت کے اصول وضوابط کا خیال رکھا جاتا تھا۔ مکتوبات کی صرف چند اقسام تھیں۔ ابتدا اور انتہا کے اصول مقرر تھے اور انہی اصولوں پر عمل ہوتا تھا۔ ان سے روگردانی قابل قبول نہیں تھی۔

روم سے ہو کر جب مکتوب نگاری قدیم یونان میں آئی ہے تو یہاں اس کو پذیرائی نہیں ملتی کیونکہ یہاں سیاسی اور معاشرتی حالات مختلف تھے۔ ہر شہری ریاست ایک سیارے میں تبدیل تھی اور ان کے درمیان روابط مفقود تھے۔ مکتوب نگاری وہاں ہوتی ہے جہاں روابط ہوں لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ لہٰذا مکتوب نگاری کے لیے یہ سرزمین زرخیز ثابت نہ ہوئی۔ یونان کے بارے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

> ہر ریاست ایک دنیا تھی معاشرت محدود تھی۔ شعبوں میں ورزش کے میدانوں میں دوستوں کی محفلوں میں لوگ اک دوسرے سے مل سکتے تھے دل کے غبار اور سر کے خمار کے لیے راہیں تھیں اپنے سیارے کے علاوہ دوسرے کا وجود ان کے لیے برابر تھا وہاں کے بسنے والوں سے انہیں اتنی ہی دلچسپی تھی یا ہو سکتی تھی جنہیں ہمیں فرشتوں سے ہے یا ہو سکتی ہے۔ فرشتوں سے دوستی کے امکانات کم ہیں اور بغرض محال یہ تعلق پیدا ہو بھی

جائے تو کیا معلوم وہ ہماری بات سمجھنے کی زحمت گوارا کریں گے یا نہیں اور پھر یہ اندیشہ کیا کم ہے کہ فرشتے مسکراتے ہیں۔

یہی حال ان یونانیوں کا تھا جن کے لیے ان کی چھوٹی سی ریاست ایک محفوظ خول کی مانند تھی جہاں تسکین کا سامان موجود ہو اور اسی باعث یونان میں مکتوب نگاری کی روایات نہیں ملتیں۔۱۳

اسی طرح اگر یونان اور روم سے نکل کر ایک نگاہ قدیم مصر میں ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مصریوں کے ہاں بھی مکتوب نگاری نے فروغ پایا۔ تین ہزار سال قبل سرزمین مصر پر ایک تحقیق کے دوران مٹی کی بنی ایسی تین سولوحیں نکلیں جن پر مصر کے فرمارواں کے نام خطوط کندہ ہیں۔ لاطینی میں بھی مکتوب کی روایت ملتی ہے اور اس سلسلے میں ہوریس (Horace) کا نام قابل نظر ہے اس نے منظوم مکتوبات لکھنے کی بنیاد ڈالی۔

مکتوب نگاری کی کھوج میں جب سلطنت انگلستان میں قدم رکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی زمین پر اس روایت کا آغاز پندرھویں صدی میں ہو چکا تھا۔لیکن ایک اور بات جو قابل بیان ہے وہ یہ ہے کہ اس سے قبل بھی وہاں مکتوبات تحریر کیے گئے تھے لیکن مکاتیب اپنے لکھنے والوں کے ساتھ ہی زیر زمین دفنا دیئے جاتے تھے۔

پندرھویں اور سولہویں صدی کے مکاتیب کا بغور جائزہ لینے پر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام مکاتیب میں الفاظ اس قسم کے ہوتے تھے جو کہ حضرت عزرائیلؑ کے صور سے کم نہیں تھے۔ آغاز کے مکتوب نگاروں میں بہت سے نام سامنے آتے ہیں۔لیکن ان کے مکتوبات بہت سے فنی خامیوں کا مجموعہ تھے۔جن میں صرف اور صرف آنے والے برے وقت کی بات ہوتی تھی یا پھر وعظ دیا جاتا تھا ہر لفظ قاری کے ذہن پر کوڑے کی مانند برستا تھا کہ گویا وہ کوئی مکتوب نہیں کفن ہے جس سے کافور کی بو آرہی ہو۔ان مکاتیب کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ ان مکاتیب میں ذاتی باتوں کے علاوہ سب کچھ موجود ہوتا تھا۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ان مکاتیب سے ان کی اصل روح پرواز کر چکی تھی۔انگلستان میں مکتوب کے فن میں جیمز ہاول کا نام اس فن کے پیشوا کے طور پر لیا جاتا ہے لیکن اس کے مکاتیب میں بھی وہی ادبی نفاستیں وکاریگری ملتی ہے۔

اس کے بعد جان ہیرنگ ٹین کا نام ملتا ہے یہ ملکہ کے درباریوں میں سے تھا۔جان ہیرنگ چوں کہ ایک سادہ لوح انسان تھا بے تکلفی اس کا وصف تھا لہٰذا یہ ہی سادگی اور بے تکلفی اس کے مکتوبات میں بھی جھلکتی ہے۔زندگی کی گرمی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اٹھارہویں صدی تک آئیں تو اس میں دو قابل ذکر مکتوب نگار ملتے ہیں۔ایک کو دنیا گرے کے نام سے جانتی ہے جو کہ شاعر تھا اس کی زندگی کے روز وشب کیمبرج یونیورسٹی کے درو دیوار میں گزرے گہرے کے کردار کا مطالعہ کیا جائے تو سب سے نمایاں پہلو اس کی فطری جھجک جو اس کو عوام الناس سے دور رہنے پر مجبور کرتی اور اس کو حواص پسند بناتی ہے۔

گہرے کے مکاتیب بھی خاص دوستوں کے نام ہیں۔ان میں اس کی نفاست ادبی ذوق اور گہری انسانیت جھلکتی ہے مگر یوں کہ جیسے بدن کی سرخی بدن کی تہہ میں جھلکتی ہے۔ دوسری خاتون ہے دنیا اس خاتون کو میری ارٹلے مانٹیگ کے نام سے یاد کرتی ہے اس کے مکاتیب زیادہ تر اس کی بیٹی کے نام ہیں۔جن میں بچوں کی تربیت کے متعلق رہنما اصول ملتے ہیں۔اگرچہ سارے مکاتیب موضوعی یکسانیت دیکھنے کو ملتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ یکسانیت گراں نہیں گزرتی۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں

> عورتوں میں خوش ہونے اور خوش کرنے کی صلاحیت مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔یہی صلاحیت خطوط کی جان ہے۔شاید اس لیے یہ خیال عام ہو گیا کہ خط لکھنا عورتوں کا حصہ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ دنیا کے بہترین خطوط خواتین کے قلم سے سرزد ہوتے ہیں۔۱۴

رومانوی دور کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس دور میں انگلستان کی زمین سے بہت سے کامیاب مکتوب نگاروں نے جنم لیا۔ ان میں چارلیس لیمب جو کہ مضمون نگار ہی نہ تھے ایک بہت اچھے مکتوب نگار بھی تھے۔اس کے مکتوب میں رومان اپنے عروج پر ہے۔موت کا ذکر یوں کرتا ہے کہ زندگی سے انسان کو عشق ہو جاتا ہے۔ چارلس لیمب کے بعد کیٹس کا نام بھی قابل ذکر ہے اس کے علاوہ شیلے اور باٹرن کے مکتوبات ملتے ہیں لیکن کیٹس کے خطوط میں جو رنگا رنگی ہے دیگر مکتوب اس سے خالی نظر آتے ہیں۔کیٹس کے وہ مکتوبات جو اس نے اپنی محبوبہ کے

نام تحریر کیے ہیں یہ مکتوبات کی دنیا کا بلاشبہ ایک شاہکار ہے۔ان مکتوبات میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا لکھنے والا خود لکھتے ہوئے برف کی مانند پگھلتا چلا جا رہا ہو۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام مکتوبات کے آغاز پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> اس جائزے سے ہمیں دو تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔مکتوب نگاری باقاعدگی کے ساتھ سرو کے دور میں شروع ہوتی ہے۔بلاغت کے اصولوں نے اس فن کو صبح کی سادگی سے محروم کر دیا۔لیکن رفتہ رفتہ یہ غازہ بڑھتا گیا۔ انگلستان میں مکتوب نگاری کا آغاز اطالوی کے ترجموں سے ہوا اور مکاتیب کئی مرحلوں سے گزرے ان میں بہترین مکاتیب ان لوگوں کے ہیں جن کی زندگی خاص معنی میں علمی زندگی تھی۔دوسرے جو عملی زندگی سے ایک حد تک آشنا تھے لیکن جن کے اپنے عمل کا دائرہ محدود تھا۔ان باتوں کے علاوہ دلچسپی کی خاطر بھی یاد رکھیئے کہ دنیا کے بہترین خطوط عورتوں اور شاعروں کے مرہون ہیں۔۱۵

شام، یونان، مصر اور انگلستان کی سرزمین سے ہوتے ہوئے جب خطہ عرب میں قدم رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مکتوبات نگاری کا آغاز نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ میں بھی جاری وساری تھا۔جب نبی کریمؐ کو فتوحات سے فراغت نصیب ہوئی اور تبلیغ اسلام کے نتیجے میں لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے آتے تو یہاں اللہ کے نبیؐ نے دیگر قبائل اور ممالک کو اسلام کی دعوت دینے کا سوچا۔یہ دعوت مکتوب نگاری کے ذریعے سے دی گئی۔نبی کریمؐ کی زندگی میں ہی ان کو جمع کرنے کا کام شروع ہو گیا۔

خلیفہ دوم کے دورِ خلافت میں بھی مکتوب نگاری جاری وساری رہی۔ان کے خطوط سے اس دور کی فوجی، انتظامی اور معاشرتی اصلاحات کا تذکرہ ملتا ہے۔حضرت عمرؓ کے دور میں ہمیں جو مکتوب نگاری ملتی ہے اس میں ہمیں باقاعدہ چند اصول وضوابط ملتے ہیں جن کو مدنظر رکھ کر مکتوب لکھے جاتے تھے۔سرنامے کی موزونیت، عنوان کی مناسبت اور القاب کا خیال رکھا جاتا تھا۔یوں اس دور میں مکتوب نگاری کی روایت نے ترقی کی۔ارتقا کے ادوار میں ایک اہم بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے دور میں جو مکتوب لکھے گئے ان میں سادگی اور اختصار کا خیال رکھا جاتا ہے۔جوں

جوں ترقی ہوتی گئی سادگی کی جگہ بناوٹ نے لی تو اس کا اثر مکتوب نگاری پر بھی پڑا۔ یہاں بھی بناوٹ اور تصنع نے راہ پالی۔مکتوب نگاری میں تکلف کی یہ روایت جو چل نکلی تو اس کا اثر ہر طرح کی مکتوب نگاری پر ہونے لگا۔مکتوب کے اندر شاہی آدب وآداب زیادہ نظر آنے لگا۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں ادبیت در آئی یوں اس فن نے سفر شروع کر دیا۔یہاں آکر مکتوب نگاری نے رنگین نثر کی جگہ لے لی۔اعجاز خسروی ہندوستان کے فارسی ادب کا نقطہ آغاز ہے۔اس کے اندر بھی ہمیں تکلف زیادہ ملتا ہے سادگی مفقود ہے۔

آگے چل کر ہمیں مکتوب نگاری کے سلسلے میں ابولفضل کا نام ملتا ہے۔ان کے مکتوب میں ہمیں تھوڑا نیا انداز ملتا ہے۔انھوں نے مکتوب نگاری کو پیچیدہ بنا دیا۔ان کے نجی خطوط اگرچہ کچھ آسان زبان میں ہے مگر ان کے پیچیدہ ہونے میں شک نہیں۔ابوالفضل کی شخصیت ان کے اندر جھلکتی ہے۔اس لیے ان کے خط ادب کے فن پاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی مکتوب نگاری کے اندر دو اور اہم نام سامنے آتے ہیں۔ان میں اورنگ زیب عالمگیر اور چندر بھان برہمن سامنے آتے ہیں۔ان دونوں کی مکتوب نگاری میں ہمیں انفرادی رنگ بھی ملتا ہے اور سادگی اور سلاست بھی ہے۔اورنگ زیب کے مکتوب عرب کے اہم فن پارے شمار ہوتے ہیں۔ان میں بلاغت بھی ملتی ہے۔چندر بھان برہمن کے مکتوب میں اس دور کے عام رواج سے ہٹ کر سادگی آگئی جاتی ہے۔

(ج)اردو ادب میں مکتوب نگاری:

سرزمین ہندوستان پر صدیوں تک فارسی زبان کا راج رہا۔اس راج نے ادب کو بھی متاثر کیا۔آغاز میں فارسی زبان میں غزل کہی جاتی اور نثر میں بھی یہی موزوں ترین زبان تھی۔ الغرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ فارسی لکھتا اور سننا اپنا فخر سمجھتا تھا۔لہٰذا ادبی اور سرکاری مقاصد کے لیے فارسی زبان ہی استعمال ہوتی تھی۔اس لیے اس زبان کی موجودگی میں دیگر مقامی زبانیں ترقی نہ کر پائیں۔

لیکن جوں ہی مغل حکومت کا زوال شروع ہوا اس کے ساتھ ہی ایک حد تک فارسی زبان کی تنزلی کا دور بھی شروع ہوا اور یہ ہی وہ دور تھا جس میں اردو زبان نے عروج حاصل کیا۔ ابتدا میں مکاتیب، فارسی کے ہی زیر اثر رہے کیونکہ جو لوگ مکاتیب لکھنے والے تھے ان کے پیش نظر فارسی مکاتیب کی ہی روایت تھی۔ لہٰذا ابتدائی اردو مکاتیب میں بھی وہی تکلفات، القاب وآداب اور سرنامے وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں انگریزوں نے تجارتی غرض سے ہندوستان میں قدم رکھا تو انھوں نے مقامی آبادی کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لیے اردو سیکھنے کا فیصلہ کیا اسی مقصد کے اردو کے لغت اور قواعد کی کتابیں تیار کی جانے لگیں۔

ڈاکٹر شاداب تبسم لکھتے ہیں:

> اردو میں مکتوب نگاری دوروشوں پر آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک روش وہ جس میں فارسی کے رنگ کی تقلید کی جاتی تھی۔ وہی زبان کے حسن وآراستگی کا معیار تھا۔ دوسری روش تھی جدید طرز کی جن کی مثالیں بھی انہیں کے یہاں موجود ہیں۔ جنھوں نے فارسی کی تقلید کی۔ ابتدا میں یہ طرز مقبول تھا لیکن غالب جیسا مکتوب نگار ہمیں یہ سوچتا نظر آتا ہے کہ اس نے بہت سے خطوط ہاتھ سنبھال کر نہیں لکھے۔۱۶

اردو نثر فارسی کے اثر سے آزاد ہونے لگی۔ قدیم انشا پردازی کو خیرباد کہا جانے لگا اور جدت کے ساتھ تعلقات ہموار ہوئے۔ یہی جدت مکاتیب کے اندر بھی برتی جانے لگی۔ لہٰذا اسی اسلوب کی بنا پر غالب کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے مکالمے کو مراسلہ بنانے کا دعویٰ کیا۔ لیکن اس دعویٰ کے باوجود بھی ابھی مکمل طور پر قافیہ کی پابندی، تشبیہات واستعارات سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکا۔ اگر اردو مکتوبات کے ارتقا کی طرف جائیں تو اس سلسلے میں ایک اہم نام مرزا قتیل کا ہے۔ ان کے مجموعہ مکاتیب کا نام ''معدن الفوائد'' ہے۔ اس میں اردو کے پانچ مکتوبات ملتے ہیں۔ اگر ان مکاتیب کا اگر جائزہ لیا جائے تو دو باتیں سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ القاب وآداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں ملتا اور دوسرا یہ کہ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔

غلام غوث بے خبر کا نام بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ''انشائے بے خبر'' ان کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ اس میں تیس مکاتیب ملتے ہیں۔ ان مکاتیب کا مطالعہ کرنے پر ایک بات واضح ہو جاتی ہے وہ یہ کہ بے خبر کے اسلوب میں اگرچہ سادگی موجود تھی لیکن پھر بھی وہ فارسی کے اسلوب سے مکمل طور پر دامن چھڑانے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ تمام مکاتیب کے اندر فارسی کی طرز پر القاب وآداب ملتے ہیں۔ سادگی کے وصف کے باوجود بھی ان کے مکاتیب ان کے بے تکلف جگری دوستوں کا پتہ دینے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں لیکن اس سب انداز کے باوجود بھی بے خبر اس وقت کی شاہی ماحول کی جو مخصوص فضا چل رہی تھی اس سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نئی راہ بنانے کا فیصلہ کیا۔

رجب علی بیگ سرور بھی اس سلسلے میں ایک اہم کڑی ہیں۔ سرور کے لکھنے کا انداز ایک طرف موجودہ عہد کی تہذیبی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف لکھنوی تہذیب کا نمائندہ بھی لگتا ہے۔ سرور کے مکاتیب کے مجموعے کا نام ''انشائے سرور'' ہے۔ سرور کے اسلوب کی ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ اسلوب بیک وقت سادہ بھی ہے اور رنگین بھی۔ روایتی انداز بھی اپناتے ہیں اور القاب وآداب اور تمہیدی انداز استعمال کرتے ہیں تو دوسری طرف جدت کے پیش نظر عبارت کو آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ طنز ومزاح بھی ان کے مکاتیب میں پایا جاتا ہے۔ مکالمے کے انداز بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر:

> قبلہ بندہ تسلیم بجا لاتا ہے اور جو کام کرتا ہوں اس کی داد پاتا ہوں۔ آپ کی پوسٹ ماسٹر تک رسائی ہے۔ میں نے ہر کاروں سے رسم بڑھائی ہے گویا ہم پلہ نہیں کم ہوں مگر قدم بقدم ہوں۔۱۷

رجب علی بیگ سرور نے جو الفاظ استعمال کیے وہ جدید الفاظ تھے۔ لفظ کی تازہ شکل استعمال کرتے تھے اور اسی وجہ سے ان کے استعمال کردہ الفاظ میں سے آج بھی بہت کم ایسے لفظ ہوں گے جو متروک ہو چکے ہوں۔ اردو مکتوبات کے سرمایہ میں نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے مکتوبات نے بھی گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ ان مکاتیب کا انداز اور اسلوب ان کو اپنے پیش

رووں سے ہم آہنگ کرتا ہے اور دوسری طرف ان میں غالب کے لہجے کی کھنک بھی سننے کو ملتی ہے۔

مگر منظوم مکاتیب لکھنے کا رواج نواب واجد علی شاہ سے قبل بھی موجود تھا لیکن واجد علی شاہ نے اس طرز کو مزید خوبصورتی عطا کی۔ جس انداز سے قافیہ پیمائی ان کے مکاتیب میں موجود ہے یہ اس چیز کی گواہی ہے کہ واجد علی شاہ کو رقص وموسیقی سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کے مکاتیب سے ان کی پسند وناپسند کا اندازہ اچھے طریقے سے لگایا جا سکتا ہے۔ واجد علی شاہ کے ایک مکتوب کو کوکب قدر سجاد علی نے اردو نثر کا پہلا خط قرار دیا ہے اور اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کوکب سجاد علی لکھتے ہیں:

> دوم ذی مقدہ ۱۲۷۲ھ (مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۶ئ) کا خط اردو نثر کا پہلا خط ہے۔ منظوم خط اس سے پہلے بھی لکھے گئے لیکن نثر میں اس خط سے قبل کا اور کوئی خط نہیں ملتا۔ القاب سے دستخط تک ایک ایک لفظ غور سے دیکھے جایئے سرورؔ یا غالبؔ کی پرچھائیں بھی اس خط میں نظر نہ آئیں گی۔ لیکن اس کے باوجود اپنائیت اختصار اور خلوص کوئی ایسی خوبی نہیں جو اس خط میں نظر نہ آئے۔۱۸

اگر بیگمات کے خطوط پر نگاہ ڈالی جائے تو اس میں ہمیں القاب وآداب بھی ملتے ہیں اور دعائیں، کلمات بھی اور یہیں چیزیں ان کے اسلوب میں جدت کی گواہ بن جاتی ہیں۔ واجد علی شاہ نے اس بات کا خاص اہتمام کروایا تھا کہ اس کی بیگمات کے جذبات واحساسات اس تک پہنچتے رہیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے اس نے اپنی ان بیگمات کے لیے جو کہ پڑھنا لکھنا نہ جانتی تھیں ان کے لیے لائق اور اہل علم منشی مقرر کر رکھے تھے جو کہ بیگمات کے جذبات اور لفظوں کو واجد علی تک پہنچانے کا کام کرتے تھے۔

اردو ادب میں اگر مکتوبات کے زمانہ عروج کی بات کی جائے تو اس میں بلاشبہ کسی کو غالب کے نام پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اگرچہ غالب سے قبل بھی مکتوبات اردو زبان میں تحریر ہوئے لیکن اس صنف کو جو مقبولیت غالب نے عطا کی وہ کوئی اور نہ دے سکا۔ غالب ہی وہ شخص

تھا جس کی وجہ سے مکتوب نویسی ادب کی ایک مستقل صف قرار پائی۔ غالب سے قبل نثر مقفیٰ و مسجعیٰ تھی اور مکتوبات میں بھی یہی روش چلی آرہی تھی۔لیکن غالب جس طرح ایک ''باغی شاعر'' تھا اس طرح وہ ایک جدت پسند مکتوب نگار بھی تھا۔غالب نے فرسودہ اسلوب سے روگردانی کی اس کے ہاں نہ تو روایتی القاب وآداب ملتے ہیں اور نہ ہی صرف لفاظی۔غالب کے مکتوبات میں پہلی مرتبہ لفظوں کو قوت گویائی ملی۔ایسے مکتوبات جو زندگی سے بھرپور ہوں نہ غالب سے قبل کسی نے لکھے اور نہ ہی آج تک کوئی لکھ پایا ہے۔

مکتوبات لکھنے کا فن بھی شعر کی طرح ہے جو قدرت ہر کسی کو برابر نہیں دیتی۔

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> خطوط کا مطالعہ عشق ومحبت کا ہے۔جس طور پر محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی۔اسی طور پر خط بھی لکھ جاتا ہے لکھا نہیں جاتا۔محبت کے دیوتا کی مانند خط کا دیوتا بھی اندھا ہوتا ہے۔ تصانیف پیشہ کی (ترجمان ہوتی ہیں) اور خطوط شخصیت کے ترجمان ہوتے ہیں۔انسان کی اصل سیرت کی غمازی اکثر دو چیزیں کرتی ہیں۔یعنی وہ موجود ہو تو اس کے ساتھ کھلئے وہ کھل جائے گا اور نظروں سے اوجھل ہو تو اس کے پرائیویٹ خط دیکھئے وہ پکڑا جائے گا۔۱۹

مرزا غالب کے ذاتی خطوط کا پہلا مجموعہ ان کی زندگی میں ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعے کا نام عودِ ہندی تھا۔دوسرا مجموعہ اردوئے معلی تھا یہ مجموعہ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔تیسرا مجموعہ امتیاز علی عرشی نے ۱۹۳۷ء میں مکاتیب غالب کے نام سے مرتب کر کے شائع کروایا تھا۔ چوتھا مجموعہ ''نادر غالب'' کے نام سے میر افضل علی عرف میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین دہلوی نے شائع کروایا تھا۔ مرزا غالب نے اپنے مکاتیب میں سادہ اور سلیس انداز بیان اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں انھوں نے مکاتیب لکھنے شروع کیے اس زمانے میں ان کی فارسی سے آشنائی کو ایک زمانہ گزر چکا تھا اور فارسی میں ان کا کمال عروج تک پہنچ چکا تھا۔ حقیقت غالب پر آشکار ہو چکی تھی کہ عبارت میں نئی تراکیب، استعارے اور قدم قدم پر پیچ ڈالنا اور عبارت کو مشکل سے مشکل تر بنانا کوئی اچھا عمل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اپنے مطالب

ومفہوم کو اس انداز سے پیش کرنا چاہیے کہ قاری آسانی سے آپ بات کی تہہ تک پہنچ جائے لہٰذا غالب نے ایک ایسی طرز ایجاد کی جو کہ سادہ، سلیس اور آسان تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ غالب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے اس آسانی کو سہل وممتع بنا دیا۔

مرزا کے انداز میں سب سے بڑی خوبی ان کا بے تکلف اور بے ساختہ انداز ہے۔ مکاتیب کے مطالعے کے دوران کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ غالب نے الفاظ کے انتخاب یا مطالب کی تلاش وجستجو میں کاوش سے کام لیا ہو۔ جس طرح غالب کی شاعری میں آمد ہے آورد نام کو نہیں ملتی اسی طرح غالب کے مکاتیب میں بھی کوشش کا عمل دخل کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ غالب کا خاصہ ہے چاہے وہ نظم ہو نثر جدت کی انتہا ایہ ہے کہ اپنے مکتوبات میں اپنے مطلب کے لیے ہمیشہ نئے سے نئے لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح نہ صرف مخاطب کے لیے نئے سے نئے لفظ لکھتے بلکہ اپنا نام بھی نت نئے انداز میں رقم کیا کرتے تھے۔ بعض جگہ ''غالب'' کہیں ''نجات کا طالب غالب'' اور کہیں بالکل نرالا انداز اختیار کرتے تھے۔ غالب کے مکاتیب میں نہ صرف ان کی ذات سے متعلق آگاہی دیتے ہیں بلکہ یہ ہر سطح چاہےوہ معاشی ہو چاہے معاشرتی چاہے سیاسی اپنے دور کی بہترین عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غالب کے مکاتیب میں جابجا طنز ومزاح دکھائی دیتا ہے اور قہقہے اور مسکراہٹیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ صرف ہنسنے اور ہنسانے کے واسطے نہیں اگر ان کی تہہ تک جایا جائے تو اس کے پیچھے دکھ، درد اور ماتم کی فضا ملتی ہے۔ ہر شخص کی اپنے وطن سے محبت ایک فطری عمل ہے۔ اسی طرح غالب کو بھی دلی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ لیکن جب دلی کو تباہ کیا گیا تو اس تباہی نے غالب کو اندر تک گھائل کر کے رکھ دیا تھا۔

بقول غلام رسول مہر اسی وجہ سے غالب کا:

> ہر گوشہ خط شخصیتوں پر آنسوؤں سے تر ہے لیکن ان سب کے باوجود ان کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے اپنے غم وآہ وبقا اور نالہ فریاد میں بھی توازن برقرار رکھا ہے۔۲۰

غالب کے مکاتیب ان کے دور کا بہترین نقشہ بھی ہیں۔جو کچھ ان کے گردوپیش میں ہو رہا تھا۔اس سے پوری طور پر باخبر تھے۔۱۸۵۷ء کے بعد دلی کے حالات اپنے ایک مکتوب میں بیان کرتے ہیں۔میر مہدی کو لکھتے ہیں:

> تم آتے ہو، چلے آؤ، جان نثار کے چھتے کی سڑک، نہال چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھنا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ، غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے آؤ۔۲۱

اگر دیگر مکتوب نگاروں کے مکاتیب پر نظر ڈالی اور ان کا غالب سے موازنہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ کسی اور کے ہاں نہ تو اس قدر جزئیات نگاری ملتی ہے نہ اتنی دلکش تصویر کشی اور نہ ہی زندگی کی اپنی تفصیلات جس حد تک غالب نے بیان کی ہیں۔اگرچہ غالب ایک زبردست انا رکھنے والا شخص تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے مشکل وقت ظاہر کرتے ہوئے نہیں گھبرایا۔

مکتوب نگاری کا دوسرا دور سرسید اور ان کے دوست احباب کا ہے۔ان کے دوست احباب زیادہ تر وہی لوگ شامل ہیں جو کہ تحریک علی گڑھ سے وابستہ تھے۔لہٰذا اس دور کے مکتوبات میں تحریک علی کے اثرات اور مقاصد واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے مکتوب نگاروں کے ہاں جو ایک مشترک صفت پائی جاتی تھی۔سادہ نویسی اور عام فہم انداز تھا۔ایک اور تبدیلی جو دیکھنے میں آئی تھی وہ انگریزی کے الفاظ کا استعمال تھا۔جو مکتوب نگاروں نے اپنے اپنے مکتوبات میں کیا تھا۔اس دور میں نئے رجحانات سامنے آتے ہیں اور ایک خاص طرز جس پر انگریزی ادب کے اثرات تھے۔اس کی نمائندگی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس دو رمیں جو سب سے اہم رجحان سامنے آتا ہے۔وہ عقلیت پسندی ہے۔

سرسید احمد خان کی مکتوب نگاری کا جائزہ لینے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے مکتوبات میں سادگی بدرجہ اتم موجود تھی۔تکلف اور تصنع نام کو نہ تھی۔سرسید کے مکاتیب میں جو چیز سب سے زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے وہ ان کی قومی ہمدردی کا جذبہ ہے۔جو ان کی دیگر تحریروں کی طرح مکتوبات میں نمایاں ہے۔لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے مکاتیب میں شخصی

عناصر موجود ہی نہیں۔اگر یہ کہا جائے کہ سرسید نے نہ تو ادبی خطوط لکھے اور نہ ہی اپنی ذات کے لیے لکھا بلکہ ملکی مفاد میں لکھا تو یہ بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔

اگرچہ ان کے مکتوبات ذاتی حیثیت کے نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے روز وشب قلب ونظر اور فکر وفہم کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ سرسید کے مکاتیب ایک مقصد کے پیش نظر تھے ان کی غرض اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں تھی۔لہٰذا ان کے مکتوبات میں بہت کم ایسے ہوں گے کہ جو ان کی ذات یا ان کے حالات سے متعلق معلومات فراہم کریں۔

سرسید احمد خان کے مکتوبات غالب کی طرح مکالمے نہیں ہیں اور نہ ہی یہ خطوط مکتوب نگاری کے شوق کے تحت لکھے گئے ہیں۔لیکن کچھ مکتوبات ایسے بھی ہیں جو اپنے بے تکلف دوستوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ طرز غالب ہے جس میں القاب وآداب یا کوئی مخصوص آغاز نہیں ملتا ایک خط کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

> واہ واہ جناب محسن الملک، واہ واہ، عنایت نامہ رجسٹری شدہ پہنچا۔ الٹی شکایت، متعدد خط بھیجے ایک کا جواب نہیں آیا۔تار تک کا جواب رحمت نہیں ہوا اور ہم کو لکھا جاتا ہے کہ تم بھول گئے اور خط نہیں لکھا، واہ حضرت واہ، آپ کا عنایت نامہ آیا خدا کا شکر کیا۔آپ خوش ہیں، اچھی طرح ہیں، یہی ہم چاہتے ہیں۔۲۲

سرسید احمد ایک بے باک انسان تھے وہ دل کی بات دل میں نہ رکھتے تھے اس کو بیان کر دیتے تھے۔جن لوگوں کے ساتھ ان کا اختلاف بھی ہو جاتا اس کو ذاتی نہیں بناتے تھے۔ایک دفعہ سرسید اور وقار الملک کا کالج کے کسی معاملے پر اختلاف ہو گیا لیکن اس اختلاف کو اپنے تعلقات پر اثر انداز نہ ہونے دیا ان کے مکتوبات میں جھوٹوں کے لیے محبت کا جذبہ جابجا ملتا ہے۔ مکتوبات میں ان کی زبان آسان، سادہ اور رواں ہے۔ سہل ہونے کے باوجود یہ ایسی زبان ہے جو آئندہ کے سائنسی تقاضوں کو بہت اچھی طرح سے پورا کر سکتی ہے۔سرسید تحریک علی گڑھ کے امام تھے اور اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ان کا اصل مقام لوٹانا تھا۔سرسید کو جب ایک مکتوب نگار کے

طور پر دیکھا جائے تو وہ یہاں بھی اسی مقصد کو لے کر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ ہر طرح کے تکلف سے پاک اسلوب ہے۔جس میں ایک مصلح قوم اور ایک لیڈر کی جھلک ملتی ہے۔ سرسید احمد خان کے رفقاءمیں سے ایک اہم نام مولوی نذیر احمد دہلوی کا ہے۔نذیر احمد کے مکاتیب کی جو بات سب سے اہم نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے مقصدیت کے ساتھ ساتھ ادب کے فنی تقاضوں کو بھی مد نظر رکھا۔ان کے مکاتیب کا مجموعہ ''مواعظہ حسنہ'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔

ان کے مکاتیب ان کے بیٹے کے نام ہیں اور ان کا مقصد اپنے بیٹے کی تربیت تھا۔لیکن اس کے باوجود مولوی نذیر احمد تخلیقی ادیب کا منصب نہیں چھوڑتے۔ان کا اسلوب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس حد تک خوبصورت اور دل نشیں ہے کہ اس میں افسانے کا روپ ملتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے مکاتیب میں قواعد، انشا، املا اور لفظوں کے تلفظ پر بھی بہت اثر انگیز مباحث ملتے ہیں۔ لیکن ان خشک مباحث کو بھی اس خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری پر گراں نہ گزریں اور وہ ان سے لطف اٹھائے۔

سرسید کے مشن میں شریک ایک اور نام مولانا الطاف حسین حالی کا ہے۔حالیؔ ،غالبؔ کے شاگرد تھے۔اس رشتے کے باوجود بھی ان کی نثر میں کہیں غالب کا رنگ نہیں دکھائی دیتا۔ حالی نے جتنے بھی مکاتیب لکھے ان سے ان کا خلوص، محبت، درد اور قوم کے لیے ایثار کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مکاتیب میں کہیں کوئی پردہ نہیں ملتا وہ ایک بے ضرر انسان تھا۔ان کے مکاتیب سرسیدکے مشن کے عکاس ہیں اور ملک وقوم کے لیے ان کی محبت کے گواہ۔

بعض مکاتیب ایسے ہیں جن میں وہ اپنی گھریلو زندگی کو زیر بحث لاتے ہیں۔حالی جذباتی طور پر ایک نرم مزاج انسان تھے۔ان کی تحریروں میں کبھی بھی کھلنڈرا پن نہیں جھلکتا۔حالی ایک مضبوط کردار کے انسان تھے۔اپنے دل کی بات بیان کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ان کے القاب وآداب کو پڑھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا آج کے زمانے میں لکھا گیا مکتوب ہے۔

آپ مکتوب میں لکھتے ہیں:

مائی ڈیر مولانا عنایت نامہ پہنچا۔"الناظر" وغیرہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ آپ نے خدا کے فضل سے شعبہ ترقی اردو کے متعلق کام شروع کر دیا ہے۔ امید ہے کہ آپ نہایت استقلال کے ساتھ اس کام کو انجام دیں گے۔ سنا گیا ہے کہ مصر وبیروت وغیرہ میں اصطلاحات العلوم پر کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو آپ نے وہاں سے کچھ کتابیں منگوائیں یا نہیں۔۲۳

اس مکتوب کے اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اپنے اردگرد سے مکمل طور پر باخبر رہتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی اگرچہ غالب کے شاگرد تھے۔لیکن اس کے باوجود غالب سے زیادہ ان پر سرسید کا اثر تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مکاتیب میں سرسید کی ہی سوچ ملتی ہے۔ حالی نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا جو مرثیہ مسدس کی صورت میں لکھا وہی مرثیہ ان کے مکتوبات میں بھی ملتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید حالی کے مکتوبات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اپنے دور کے سماجی طوفان میں گھر جانے کے باوجود انھوں نے زندگی کو برتنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، چنانچہ اب مکاتیب حالی کی کوئی حیثیت ہے تو محض یہ کہ انہیں مصلح قوم حالی نے لکھا ہے اور یہ ایک ایسے بھلے مانس، حق گو اور حق شناس شخص کے خطوط ہیں، جس کے داخل وخارج اور قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔۲۴

اسی دور کے مکتوب نگاروں میں مہدی علی خان اور وقار الملک کے نام بھی ملتے ہیں۔لیکن سرسید اور حالی کی طرح ان کے مکاتیب بھی مقصدیت کے زیر اثر تھے۔ان کے مکاتیب قومی مرثیہ اور ملک وملت کے حالات کی تشریح کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ اگرچہ کچھ مکاتیب ایسے ہیں جو دوست احباب کے نام ہیں جن میں ذاتی گلے شکوے دکھائی دیتے ہیں۔لیکن تعداد میں بہت کم ہیں۔اگرچہ ان مکاتیب کی زبان ادبی ہے۔ان میں ملک وقوم کے لیے محبت جھلکتی ہے۔مگر یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہیں کہ ان کی حیثیت دستاویزی ہے۔ مہدی علی خان کے مکاتیب کا حصہ اول اور وقار الملک کے ہیں مکاتیب کا حصہ دوم کو محمد امین زبیر مارہروی نے آگرہ سے شائع کروایا تھا۔

مکتوب نگاری کے اس گلستان کا ایک اور مہکتا ہوا پھول، جس نے اس گلستان کو زندگی، شادابی اور حسن بخشا وہ شبلی نعمانی ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا کی مقصدیت سے بھرپور تحریروں کے بعد جب ہم شبلی نعمانی کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو اچانک سے صحرا میں نخلستان کا احساس ہمیں مسرور کر دیتا ہے۔ جب ہمارے نقاد ان کو مسلمان ادبا کی صف میں پیدا ہونے والا پہلا یونانی قرار دیتے ہیں تو بلاشبہ ہم اس انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے۔ جیسے یونانی ہر چیز میں حسن اور خوبصورتی کے متلاشی ہیں یہی حال ہمیں شبلی نعمانی کی تحریروں میں ملتا ہے۔

شبلی محض مقصدی ادب کے قائل نہیں بلکہ مقصد میں بھی حسن کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مکاتیب میں معنویت اور حسن دونوں یکجا ہو جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شبلی غالب کے جانشین ہیں کیونکہ ان سے قبل حسن ومعنویت کا یہ امتزاج غالب کی خاصیت تھی۔

یہ ہی مقصدیت اور خوبصورتی ان کے ہر مکتوب کو دلچسپ اور دوسروں سے منفرد کر دیتی ہے۔ لیکن ان کے ہاں ایک چیز جو غالب اور شبلی کو الگ کرتی ہے وہ ان کی ترجیحات میں فرق ہے۔ شبلی کے ہاں قوم اور اس کے مسائل اہم ترین حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور قومی ہمدردی ان مکاتیب میں اساسی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ جب کہ غالب اپنے زمانے کا اہم ترین بلکہ اپنے زمانے کا امام اور آنے وقت کے لیے بھی مشعل راہ رکھنے کے باوجود اصلاحی پہلوؤں کو ذاتی تسکین کے لبادے میں سامنے لاتا ہے۔ شبلی کے ہاں اصلاح شگفتگی وشادابی شانہ بشانہ کام کرتی دکھائی دیتی ہے اور تضاد ان کی ہمہ رنگ اور ہمت جہت شخصیت کی بدولت ہے۔

جب شبلی نعمانی کے مکاتیب میں ان کی ذات کو تلاش کیا جائے تو ہمارے سامنے ایک نیا شبلی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جس کے سینے میں ایک ایسا دل دھڑکتا ہے جس میں احساسات وجذبات ایک سمندر موجزن ہے۔ یہ مکاتیب شبلی نے عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام لکھے ہیں۔ مکاتیب میں وہ اپنی سرشاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں مصلح قوم نہیں ہمہ گوشت پوست سے بنا ایک ایسا شبلی سامنے آتا ہے جس کو یہ معلوم ہے کہ گناہ وثواب کے درمیان حدِ فاصل کس طرح قائم رکھی جائے۔ شبلی کے مکاتیب میں شبلی نعمانی ایک دنیادار کی

حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ جس کی دنیاوی ضروریات بھی ہیں لیکن وہ ان ضروریات کو خوشامد اور دغا فریب سے حاصل نہیں کرنا چاہتا۔

ان تمام خصوصیات کی بدولت اپنے زمانے کے مکتوب نگاروں میں شبلی نعمانی ایک منفرد اور ممتاز حیثیت کے مکتوب نگار دکھائی دیتے ہیں۔بقول سید عبداللہ:

> شبلی کے مکاتیب اپنی تازگی، طرفگی، ندرت، ایجاز اور اپنے آشنایا نہ سخن گسترانہ انداز کے باوجود مستقل قدر وقیمت کے مالک ہیں، ان میں مقصد کا وجود اور پیغام کا اختصار تو ہے مگر مخاطبوں کے رتبہ ومقام کا لحاظ ان کے جذبات ونفسیات کا پورا پورا شعور بھی موجود ہے۔۲۵

محمد حسین آزاد مکتوب نگاروں کی صف میں ایک اہم اور مستقل حوالہ ہیں۔ان کے مکتوب سب سے پہلے سید عبدالقادر کے رسالے مخزن میں شائع ہونا شروع ہوئے۔اس کے بعد ۱۹۰۷ء میں سید جالب دہلوی نے ان کو کتابی شکل میں شائع کروایا۔ان کے مکاتیب میں زندگی کا ہنگامہ اور شور شرابہ کم دکھائی دیتا ہے۔لہٰذا یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ بطور مکتوب نگار آزاد دھیمے اور مدھم لہجے میں بات کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک مکتوب نگاری ذاتی پسند وناپسند اور خواہشات کے اظہار کا اہم ذریعہ ہیں۔ آزاد کو اس لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ ان کا اسلوب غالب سے زیادہ ترقی یافتہ اور جدید انداز کا حامل ہے۔یہی تمام خصویات ان کے مکتوبات میں دلچسپی کا باعث ہیں۔

شعرا میں اکبر الہ آبادی کا نام بھی بطور مکتوب نگار اہمیت کے حامل ہے۔اگرچہ اس دور میں تمام ادبا علی گڑھ تحریک سے ہی متاثر تھے۔اور اسی کے زیر اثر لکھ رہے تھے۔لیکن اکبر الہ آبادی کی الگ دنیا تھی۔اگرچہ ان کا مقصد بھی اصلاح ہی تھی۔لیکن ان کا طریق باقی لوگوں سے جدا تھا۔ اکبر کو سب سے زیادہ دکھ مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا تھا اور وہ اخلاقیات کی اصلاح مذہب کے ذریعے کرنے کے خواہاں تھے اور جدیدیت کو اخلاق کا دشمن گردانتے تھے۔ مذہب ان کے مکاتیب کا ایک نمایاں موضوع ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب کے علاوہ انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ان کے مکاتیب میں مذہب کے ساتھ ساتھ علم وادب، معاشی ومعاشرتی اور

سیاسی مباحث بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اپنے مکاتیب میں دوستوں اور عزیزوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ان تفصیلات کی مدد سے ان کا روزنامچہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کا اسلوب سادہ اور دلچسپ ہے۔لیکن جو جاندار ظرافت اور طنز ومزاح شاعری میں ہے وہ مکتوب نگاری میں نہیں ملتا۔

اکبر کی مکتوب نگاری کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> حالی اور سرسید کو برصغیر کی ملت اسلامیہ کے سیاسی زوال کا غم تھا، لیکن اکبر الہ آبادی کا ذہنی کرب یہ تھا کہ سلطنت لٹ جانے کے بعد اب قوم اخلاقی اور روحانی طور پر قصرِ مذلت میں ڈوبی ہوئی ہے۔اسی داخلی کرب کو اکبر نے اپنی شاعری میں ایک صاحبِ دل مسلمان کی طرح پیش کیا ہے۔تو خطوط میں صاحب نظر عالم کی صورت میں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔۲۶

اکبر الہ آبادی کے بعد مکتوب نگاری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے اور اس میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر محمد علامہ اقبال کا ہے۔ علامہ اقبال کے مکتوبات تعداد کے لحاظ بہت زیادہ ہیں۔اب تک ان کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ شاد اقبال: مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری دورؔ

۲۔ اقبال نامہ: دو حصوں پر مشتمل ہے۔مرتبہ: شیخ عطاء اللہ

۳۔ مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خان مرحوم

۴۔ مکتوباتِ اقبال: بنام نذیر نیازی

۵۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی: مرتبہ عبداللہ قریشی

۶۔ انوارِ اقبال: مرتبہ نظیر احمد ڈار

۷۔ اقبال کے خطوط وتحریریں (انگریزی) مرتبہ: بشیر احمد ڈار

۸۔ خطوطِ اقبال، مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی

ڈاکٹر علامہ اقبال کے مکتوبات بھی ان کی شاعری کی مانند فکر وفلسفے سے بھرپور ہیں۔ان مکتوبات میں علامہ اقبال کے فلسفے کی تشریح بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی مدد سے اقبال کی شخصیت کے نادر پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مکتوباتِ اقبال کی بہت بڑی خوبی ایجاز واختصار ہے۔علامہ اقبال کے مکتوبات میں ایک ایسا شخص ہمارے سامنے آتا ہے جو کہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ قومی رہنما، دین کا عالم، فلاسفر اور سیاستدان ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ ان مکتوبات میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔اقبال کے مکتوبات میں ایک درد مند دل رکھنے والا انسان سامنے آتا ہے جو کہ امت مسلمہ کے مصائب پر خون کے آنسو روتا دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اقبال کے مکتوبات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اقبال کے خطوط میں استدلال متوازن اور حقیقت افروز ہے۔وہ الفاظ کی بھول بھلیوں میں الجھنے کے بجائے معنی کے گوہر تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اس معنی کے ساتھ گہرا جذباتی رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔چنانچہ اقبال کی نثر میں جو بے رنگی ہے وہ معنی کی نیرنگی کے ساتھ سدا بہار نظر آنے لگتی ہے اور اقبال کے ذہن رسا کے بہت سے گوشے بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔اقبال کے خطوط فکر اقبال کا ایک اہم حصہ ہیں۔انہیں اپنے عہد کے علمی وادبی اور فکری مباحث کا مخزن قرار دیا گیا ہے اور ان کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔۲۷

یوں کہا جا سکتا ے کہ شاعر مشرق جس طرح اپنی شاعری میں دردمند شاعر، فلسفی اور قومی راہنما دکھائی دیتے ہیں۔اسی طرح اپنے مکتوبات بھی وہ مسلمانوں کے مسائل کا حل تلاشنے والے متلاشی نظر آتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کے مکتوبات میں ایک ایسا مکتوب نگار سامنے آتا ہے جو معاشرے کے دوغلے پن سے نالاں ہے۔سعادت حسن منٹو وہ افسانہ نگار ہے کہ جس کے افسانوں کو اس کی زندگی میں مقدمات کی نظر کر دیا گیا۔ مگر جن افسانوں کو رد کر دیا گیا تھا آج ان ہی افسانوں پر اردو ادب ناز کرتا ہے۔

منٹو نے بے شمار مکتوبات لکھے۔ان میں بہت سے احمد ندیم قاسمی کے نام بھی ہیں جن کا ذکر بہت ضروری ہے۔جب ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مکتوبات منٹو نے تب لکھے جب وہ شہرت کی ابتدائی منازل پر تھے۔ان مکتوبات کے مطالعے کے بعد ایک اہم حقیقت جو آشکار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ منٹو ایک حق گو اور بے باک ادیب تھے۔وہ انا پرست اور اپنی ذات سے محبت کرنے والے ہیں۔ منٹو نے احمد ندیم قاسمی کے افسانوں پر تنقید ہی نہیں کی بلکہ انہیں جذبات زدہ بھی قرار دیا اور پھر جب ترقی پسند کے زیر اثر ان کی جنگ چھڑی تو منٹو احمد ندیم قاسمی سے اپنے ضمیر کی مسجد کی امامت چھیننے سے بھی گریز نہیں کرتا۔منٹو کے خطوط پر خود نمائی اور اظہار انا کا جذبہ غالب ہے۔

نیاز فتح پوری رومانوی نثر نگار تھے۔رومانوی اثرات ان کے مکاتیب کا بھی حصہ ہیں۔آزادی فکر اور جمال پسندی ان کے خاص موضوعات ہیں۔ان کے مکاتیب میں رومانویت سے سادہ نثر کی طرف پیش قدمی ملتی ہے۔ان مکاتیب کے مطالعے سے نیاز فتح پوری کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو عام نثر میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ نیاز فتح پوری جب رومانویت کی دنیا سے نکلتے ہیں تو سادگی کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن یہ سادگی غالب والی سادگی نہیں بن پاتی۔ان کے مکاتیب میں بہت کم ایسے ہیں جو خواص کے نام لکھے گئے ہیں لہٰذا یہ کہنا درست ہو گا کہ نیاز فتح پوری اپنی تنہائی میں خود سے ہی باتیں کرتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا اپنی ہی ذات کے متلاشی ہوں۔

مکتوب نگاری میں نیاز فتح پوری سب سے زیادہ میر ناصر علی دہلوی سے متاثر ہیں اور انہی کا اثر ان کے مکاتیب پر ہے۔ان کی شگفتہ بیانی ان کو متاثر کرتی ہے۔نیاز فتح پوری کے ہاں جابجا اشعار بھی ملتے ہیں جو نثر کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

محمد علی جوہر کے مکاتیب ایک ادیب سے زیادہ ایک سیاسی رہنما کے مکاتیب لگتے ہیں۔ ایک ایسا سیاسی رہنما جس کا دل قوم کی محبت سے لبریز ہو اور جو قوم کی حالت شکستہ پر نوحہ کناں ہو۔محمد علی جوہر کے اسلوب میں قوم کا دکھ درد واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔لیکن یہ ایک ایسے انسان کے طور پر دکھائی دیتے ہیں جن کی شخصیت ایسی ہے جو تمام مخدوش حالات کا جوانمردی

سے مقابلہ کرتے ہیں۔ مکتوبات میں طوالت ملتی ہے لیکن یہ طوالت گراں نہیں گزرتی۔ کہیں کہیں طنز ومزاح کی لہر بھی دکھائی دیتی ہے۔لیکن جوں ہی قوم کا خیال آتا ہے ان کی طنز ومزاح برق کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

سید سلیمان ندوی کے مکاتیب میں ایک طرف سرسید کا اسلوب ہے تو دوسری طرف یوں محسوس ہوتا ہے کہ ندوی شبلی کے سرگرم وکیل ہیں۔جوکہ شبلی کے خلاف بات سننا گوارا نہیں کرتے۔لہٰذا جب کسی نے سرسید اور شبلی کے خلاف بات کی تو ندوی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔سید سلیمان ندوی کے مکاتیب ایک علم دوست انسان کے مکاتیب ہیں اور یہ مہک قاری کے دل ودماغ کو معطر کرتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے مکاتیب میں دو طرح کے رجحانات ملتے ہیں۔پہلے دور میں ان کے مکاتیب اعتدال سے خالی ہیں لیکن دوسرے دور میں یہ دریاکناروں پر سمٹ کر مائل بہ اعتدال ہوتا دکھائی دیتا ہے۔لیکن جو بات دونوں ادوار میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ مزاح کی ایک ہلکی سی لہر دونوں ادوار میں موجود رہتی ہے۔ نیاز فتح پوری کی طرح عبدالماجد دریا آبادی کے ہاں بھی ہم کلامی زیادہ ملتی ہے۔وہ اپنے علم کو خود اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اس کو صدقہ سمجھ کر دوسروں پر تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی سلسلہ تصوف کے ایک بہت بڑے رہنما تھے۔ان کے زیادہ تر مکاتیب تبلیغی مقاصد کے پیش نظر لکھے گئے ہیں۔سادگی کے باوجود پرکاری موجود ہے۔خواجہ حسن نظامی اپنے مکتوب الیہ کی ذات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔اندازِ بیان اس حد تک خوبصورت ہے کہ بات دل میں اثر کر جاتی ہے۔ان کی باتوں میں کہیں بھی الجھاؤ نہیں ملتا۔

مولانا ابواعلی مودودی ایک صاحب ایمان، حق پرست، اور درویش انسان تھے۔ مولانا مودودی کو داخلی اور خارجی طور پر بہت سے مخالفین کا سامنا تھا۔لیکن اس مخالفت کے باوجود بھی وہ حق بات کہنے سے نہیں گھبراتے تھے۔ ان کے مکاتیب میں بھی تبلیغی انداز ملتا ہے۔اندازِ بیان سادہ ہے لیکن اس کے باوجود موثر اور بلیغ ہے۔الغرض یہ کہنا درست ہو گا کہ مکاتیب کے ذریعے سے اسلامی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچاتے تھے۔

طبقہ شعرا میں جگر مراد آبادی کے مکاتیب کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان کو جناب مصطفی راہی نے مرتب کر کے شائع کروایا۔ موضوعات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو زیادہ تر جگر مراد آبادی نے شاعروں کو موضوع بحث بنایا ہے لیکن اس کے باوجود چند ایک مکاتیب ایسے ملتے ہیں جن کے ذریعے سے جگر کی ذات تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔ ان کے مکاتیب سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جگر کے ظاہر وباطن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ ایک سچے انسان تھے۔ ان کا اسلوب سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی بے ساختگی موجود ہے۔

یاس یگانہ چنگیزی کی شاعری جس طرح ان کی انانیت کی عکاس ہے۔ یہی حال ان کے مکاتیب کا بھی ہے۔ زمانے نے یگانہ کو اور ان کی انا کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا ان کے مکاتیب میں ایک ٹوٹا ہوا اور زمانے کا دھتکارا ہوا شخص ملتا ہے جو کہ اپنی انا کو سنبھالے ہوئے ہے۔ لیکن ان کی انا پر ضرب اس وقت پڑتی ہے جب نجی ضرورتیں یگانہ کو مغلوب کرتی ہیں۔ ان کے ہاں زہر خند بھی ہے اور تلخی بھی۔ لیکن سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یگانہ اپنے کسی بھی جذبے پر کوئی پردہ نہیں ڈالتا۔

شادعارفی کے مکاتیب میں یگانہ چنگیزی کا رنگ نظر آتا ہے۔ شاد عارفی کے ہاں بھی انا اپنے عروج پر ہے۔ یہ موجود سے نااطمینان دکھائی دیتے ہیں۔ شادعارفی کے مکاتیب ان کی زندگی کے مکمل عکاس ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ شاد عارفی کے مکاتیب ان کی زندگی تک رسائی کا ایک عمدہ وسیلہ ہیں۔ ان میں شاد عارفی کی ذہنی کیفیات سے آگہی ملتی ہے۔ شادعارفی ایک ایسا موسیقار ہے جس نے اپنی زندگی کے کچھ اصول وضوابط مقرر کر لیے ہیں اور ان سے روگردانی اس کے لیے گناہ کا درجہ رکھتی ہے۔ شادعارفی کے مکاتیب ان کی شاعری کے تخلیقی پس منظر سے آگاہی کا بہترین ذریعہ ہیں۔

محمد علی ردولوی کے مکاتیب کا مجموعہ ”گویا دبستان کھل گیا“ ہے اس مجموعے کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ردولوی میں غالب کا اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مخاطب ان کے سامنے موجود ہے اور وہ اس سے ہم کلام ہوں۔ ڈاکٹر انور سدید محمد علی ردولوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> محمد علی ردولوی ایک چنی ہوئی تہذیب کا آخری مشاہد ہے، لیکن انھوں نے شوکت رفتہ کا ماتم کرنے کے بجائے جدید زمانے کا ساتھ دیا۔ چنانچہ ان کے خطوط میں انسانی قدروں کے احترام کے ساتھ نئے زمانے سے محبت کا انداز بھی ملتا ہے۔ وہ ایک ایسے مکمل انسان نظر آتے ہیں جو خیر وشر کی قوتوں کو متوازن کرنے اور مسرت کے علاوہ غم کے ساتھ بھی نباہ کرنے کا سلیقہ جانتے ہوں۔ محمد علی ردولوی کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی اس کی پرزد نثر اور زندگی افروز اسلوب ہے۔۲۸

اپنے دل ودماغ کی بات قاری تک پہنچانے کا گر ان کو بہت اچھے سلیقے سے آتا تھا۔ جب وہ اپنی ذات کی بات کرتے ہیں تو اس میں بھی پوری کائنات کو اپنا ہم زبان بنا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر تاثیر کے مکاتیب میں دو مختلف اندازِ فکر ملتے ہیں۔ ایک وہ مکاتیب جو کہ ان کے شاگرد محمد نظامی کے نام ہیں۔ ان کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک شاگرد کو درس دیا جا رہا ہو۔ یہ مکاتیب مکمل طور پر علمی وادبی ہیں اور ان میں تکلف وتصنع کی فضا ہے۔ لیکن دوسری طرف جو مکاتیب مولانا سالک اور غلام رسول مہر کے نام ہیں ان میں تاثیر کا اسلوب بے تکلف اور دوستانہ ہے۔ تاہم ان مکاتیب کی تعداد محدود ہے اور یہ تاثیر کی مکمل شخصیت کو آشکار کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ مکاتیب ایسے بھی ہیں جن میں تاثیر نے اپنی ذات کے کچھ پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے اور اپنے اردگرد پر آزادانہ نگاہ ڈالی ہے۔ ایک اور بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ شعر ونغمہ تاثیر کی زندگی کا ایک دوست ہے جوان کی تنہائیوں میں ان کے ساتھ ہنستا اور روتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بطور مکتوب نگار کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے مکتوبات کا پہلا مجموعہ ''غبار خاطر'' مئی ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں تمام مکاتیب مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے نام ہیں۔ اس مجموعے میں دو قسم کے مکاتیب شامل ہیں۔ پہلی قسم علمی ادبی اور فلسفیانہ مکاتیب پر مشتمل ہے۔ جبکہ دوسری قسم مولانا آزاد کی ذات اور ان کے گردوپیش کے حالات سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسرا مجموعہ کاروان خیال ہے جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا اور اس مجموعے میں مولانا آزاد کے سترہ مکاتیب ہیں جبکہ دس مولانا شیروانی کے ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''نقشِ آزاد'' ہے اس کو

غلام رسول مہر نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ یہ مکاتیب مولانا آزاد اور مولانا غلام رسول مہر کے تعلقات کی دستاویز ہیں۔ مولانا آزاد کے مکاتیب میں رجائیت پسندی ہے۔ نثر میں ربط کا خیال رکھا گیا ہے۔ انداز بیاں رواں اور سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی گہرائی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی تعلیمات کا بیان بھی ملتا ہے۔ جابجا اشعار کے استعمال سے مکتوب میں رنگینی پیدا کرتے ہیں۔

ناقدین میرا جی کو نفسیاتی ادیب گردانتے ہیں۔ میرا جی نے زندگی میں ان چیزوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو عقل کے دائرے میں نہیں آتیں۔ وہ بن دیکھے چیزوں پر ایمان لانے کے قائل نہیں۔ اگر میرا جی کا مطالعہ ان کے مکاتیب کی روشنی میں کیا جائے تو یہاں شاعری کے برعکس عقل مند ادیب کی صورت سامنے آتے ہیں جو کہ زندگی اور اس کے تمام پہلوؤں کو پورے دھیان سے دیکھا اور ان کے تمام مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کے حل کے لیے سرگرداں رہتا ہے۔ یہ مکاتیب اس بات کے گواہ ہیں کہ بظاہر لاپرواہ نظر آنے والا میرا جی معمولی کتابوں کی اشاعت کے لیے بھی پریشان نظر آتا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق اس کی توجہ کا مرکز ہے۔

ڈاکٹر انور سدید میرا جی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> حلقہ ارباب ذوق میرا جی کی رگ حیات تھا اور وہ اسے فکر و نظر کا مضبوط پلیٹ فارم بنانے میں بے حد مستعد نظر آتے ہیں، چنانچہ وہ سطوری دائرہ جو میرا جی کی شخصیت کے گرد حرکت کر رہا ہے ان خطوط میں ٹوٹ جاتا ہے اور سچا، حقیقت پسند اور بالا بین میرا جی ابھر آتے ہیں جن کے سامنے حلقے کے سب ادبا پانی بھرتے ہیں اور پوری دنیا ایک پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔۲۹

میرا جی کے مکاتیب ''نئی تحریریں'' اور ''نقوش'' میں اشاعت کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ جو تضاد میرا جی کی شاعری اور مکاتیب میں ملتا ہے وہی تضاد ابن انشا کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ابن انشا کی شاعری کو پڑھنے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابن انشا ایک جوگی اور بنجارہ ہے جس کو دنیا سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ان مکاتیب میں یہ صورتِ حال یکسر تبدیل ہو جاتی ہے۔ جوگی

اور بنجارہ ایک ایسے دنیا دار میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو کہ ایک عام گوشت پوست سے بنے انسان کی طرح بہت سی خواہشات رکھتا ہے اور زندگی سے بہت امیدیں لگائے ہوئے ہے۔ ان تضادات کے باوجود ان مکاتیب میں قاری کی دلچسپی کے تمام لوازمات موجود ہیں۔اسلوب میں رنگینی پائی گئی ہے۔طنز ومزاح اور معنویت اس اسلوب میں مزید خوب صورتی کا باعث بنتے ہیں۔لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ ان مکاتیب کی بدولت ہماری ملاقات ایک نئے ابن انشا سے ہوتی ہے۔

شاعر شباب اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے ہاں دو انتہاوں کا سفر ملتا ہے۔زندگی میں جوش کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ جوش ایک حق گو انسان تھا۔اسی حق گوئی کی یاداشت میں ان کو سقراط بننا پڑا جب دنیاان کو بہت ستاتی ہے تو جوش انسان کو وحشی اور درندہ تک قرار دیتے ہیں۔لیکن یہی زندگی جب مہربان ہوتی ہے تو وہ اسی درندہ صفت انسان کو فرشتہ تک تسلیم کرتے ہیں۔

ان کے مکاتیب سے کہیں ان کی محبت کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے تو کہیں نفرت کی انتہا سامنے آتی ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمٰی کے مکاتیب جو کہ ان کی نجی زندگی سے متعلق تھے۔ان کی وفات کے بعد شائع ہونے والے مکاتیب اپنے دور کی ادبی سیاست کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ علی گڑھ اور اس سے وابستہ شخصیات سے متعلق ہیں۔یہ مکاتیب خلیل الرحمن کے باطن تک رسائی کا وسیلہ ہیں۔

رجندر سنگھ بیدی کے مکاتیب میں ہمارا واسطہ ایک ایسے شخص سے پڑتا ہے جو زندگی اور اس کی مصیبتوں کو جھیل رہا ہے اور بیماریوں سے عاجز۔ایسے موقعوں پر لکھے گئے مکاتیب میں وہ اپنے دکھ کم کرنے کے لیے اپنی جوانی کو یاد کرتے ہیں۔ بیدی کے وہ مکاتیب جو اوپندرناتھ اشک کے نام ہیں ان میں آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات کی سختی کا مقابلہ اگرچہ وہ ثابت قدمی سے کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ان کو حاسد دوستوں کا سامنا ہے جو ان کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتے۔افسانوں کی مانند مکاتیب میں بھی ناہمواری

ملتی ہے۔ لیکن ان کے مکاتیب کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ یہ ہے کہ بیدی اپنی روح کو بلاجھجک عریاں کر دیتا ہے اور یہی صداقت ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے روحِ رواں سید سجاد ظہیر کے مکاتیب کا مجموعہ "نقوش زِنداں" کے نام سے سامنے آیا۔اس مجموعے کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ان مکاتیب میں سجاد ظہیر خانگی زندگی کو بیان کرتے ہیں اور ایک شوہر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ایک ایسا شوہر جو نہ تو سیاسی رہنما ہے اور نہ ہی ادیب۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ان خطوط میں شادی کے دورِ اول کی یادوں کو اس خوبی سے تازہ کیا گیا ہے کہ لکھنوی تہذیب کا پرتو آنکھوں کے سامنے آشکار ہو جاتا ہے۔خوبی کی بات یہ ہے کہ سید سجاد ظہیر نے خطوط میں ذاتی کرب کو سطح پر بکھیرے بغیر دردمندی کی لہر پیدا کی ہے۔یہ خطوط تہذیبی وقار، حوصلہ، استقلال اور مصائب کو جوانمردی سے جھیلنے کا راستہ دکھاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ نقوش زنداں کو مکاتیبی ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔۳۰

ان مکاتیب کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید سجاد ظہیر نے جیل کے کرب بھرے لمحات کو اپنی خانگی زندگی کے بیان سے شکست دینے کی کوشش کی اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

فیض احمد فیض نے بھی سید سجاد ظہیر والی راہ اختیار کی۔فیض کا تعلق بھی ترقی پسند تحریک سے تھا۔فیض ایک انقلابی شاعر ہونے کے ساتھ بہت نڈر اور بے باک رہنما بھی تھے۔اسی بے باکی کی وجہ سے ان کو بہت دفعہ جیل بھی جانا پڑا۔ دو جیل کے شب وروز ایک عام آدمی کے لیے شاید بہت مشکل ہوتے ہوں۔لیکن فیض نے ان لمحات کو محفل میں تبدیل کر لیا۔ان کے جیل میں لکھے گئے مکاتیب دوستوں کے نام ہیں ان میں جیل کی زندگی کا خوب صورت انداز میں نقشہ کھینچتے ہیں۔ بہت سے مکاتیب ان کی ازدواجی زندگی سے متعلق ہیں جو فیض کا روپ بحیثیت شوہر اور باپ

کے ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ فیض کے مکاتیب کا مجموعہ ''صلیبیں میرے دریچے میں'' یہ پہلے انگریزی میں تھے بعد میں فیض نے ان کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے شائع کروایا۔

صفیہ اختر کے مکاتیب کا مجموعہ ''زیر لب'' ہے اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایک عورت کی آواز سامنے آتی ہے جو کہ دل رکھتی ہے اور زندگی سے کچھ خواہشات وابستہ کیے بیٹھی ہے۔ان مکاتیب میں صفیہ اختر تمام عورتوں کی آواز بن جاتی ہے۔ان عورتوں کی آواز جو کہ معاشرتی محرومیوں کا شکار ہیں جن کو محبت نہیں ملتی۔ ان مکاتیب میں ہندی گیتوں جیسی جذباتیت موجود ہے۔اردو ادب میں اس قسم کے مکاتیب بہت کم دیکھنے میں ملتے ہیں۔ابتدا میں ان کو ایک عجوبے کی حیثیت سے دیکھا گیا۔تاہم بعد ازاں صفیہ اختر کی انفرادیت کی وجہ بن گئے۔

''آدھی ملاقات'' حسن نثار کا مجموعہ ہے۔اس میں حسن نثار اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہیں اور اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔یہ ایک مرد کی آواز ہے اور جب مرد جذبات کا اظہار کرتا ہے تو اس دوران وہ اکثر اوقات عریاں ہو جایا کرتا ہے اور یہی جذبہ ''آدھی ملاقات'' میں ملتا ہے۔

(د)ڈاکٹر انور سدید: احوال وآثار

ڈاکٹر انور سدید ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ضلع سرگودھا کے ایک دو افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں بھیرہ کے قریب اور دریائے جہلم کے کنارے پر واقع ہے۔تاریخی حوالے سے یہ شہر بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس علاقے نے بہت سے بہادروں، محنت کشوں اور تحریک پاکستان کے کارکنوں کو جنم دیا۔اس کے علاوہ سرگودھا کے سٹریس بھی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کا اصل نام محمد انور الدین تھا۔جب کہ ادبی دنیا ان کو انور سدید سے جانتی تھی۔ان کے والد بزرگوار کا نام مولوی امام الدین تھا۔ان کا شمار علاقے کے نہایت ایماندار اور شریف النفس لوگوں میں ہوتا تھا۔یہ خاندان نومسلم راجپوتوں کا خاندان تھا اور پہلے سری نگر میں رہتا تھا۔اٹھارویں صدی کے آخر میں ان کے ایک بزرگ نے ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ساتھ ہی اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد یہ خاندان سری نگر سے ہجرت کر کے میانی ضلع سرگودھا میں آباد ہوئے۔

مسرت شاہین ڈاکٹر انور سدید کے خاندان کے بارے میں یوں لکھتی ہیں:

> ڈاکٹر انور سدید کے والد گرامی کے تین بھائی تھے۔ دو ان سے بڑے اور ایک ان سے چھوٹے تھے۔ جب شاہ پور کو انگریزوں نے ضلعی مقام کا درجہ دیا تو ان کا خاندان میانی سے شاہ پور منتقل ہو گیا اور نہر لوئر جہلم کے بائیں کنارے پر سرگودھا کا شہر آباد کیا گیا تو ان کا خاندان سرگودھا کے بلاک سولہ (۱۶) میں آکر سکونت اختیار کر گیا اور پھر وہاں ان کے والد نے مکان تعمیر کیا جہاں انور سدید کا سارا بچپن گزرا۔۳۱

ڈاکٹر انور سدید کی والدہ کا نام صالحہ خاتون تھا۔ جو نہایت دیندار اور مہذب خاتون تھیں۔ گھر کا ایک کمرہ عبادت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ جس کو آخرِ عمر تک آباد رکھا۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور شوہر کی وفات کے بعد کم وبیش تیس سال زندہ رہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے پانچ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ انور سدید کی شادی ۹ مئی ۱۹۴۶ء کو ان کے کزن کی بیٹی محترمہ نصرت بیگم سے ہوئی۔ ان کے چار بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا مسعود احمد جو ایم ایس سی حیوانات کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ ان سے چھوٹے محمد امتیاز ہیں اور یہ بچوں کے ڈاکٹر ہیں۔ اس کے بعد انس اعجاز جو کہ کیمیکل انجینئر ہیں اور سب سے چھوٹا بیٹا بذل ندیم ہے اور یہ بھی انجینئرنگ کے شعبے سے وابستہ ہے۔ خاندانی روایت کے مطابق ڈاکٹر انور سدید نے مذہبی تعلیم اپنے والد مولوی امام الدین اور والدہ سے حاصل کی۔ پرائمری کا امتحان اسلامیہ پرائمری سکول سرگودھا سے پاس کیا۔ اس کے بعد آپ کا داخلہ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان میں ہوا۔ یہاں سے آپ نے مڈل کی سند لی۔ جبکہ میٹرک کا امتحان ہائی سکول نمبر ا سرگودھا سے پاس کیا۔ اس عرصے میں آپ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کی جدوجہد میں شریک ہو گئے چونکہ زیادہ وقت ان سرگرمیوں کی نذر ہوتا۔ اس لیے ایف ایس سی کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔

اس کے بعد انجینئرنگ کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ عملی زندگی کا آغاز محکمہ آب پاشی میں ۱۹۴۸ء کو بطور سب انجینئر کے طور پر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایف اے اور بی اے کی ڈگریاں صرف انگریزی کا امتحان پاس کر کے لیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئر ڈھاکہ سے اے ایم آئی ای (AMIE) کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۷ء میں انجینئر کے عہدے سے ترقی کر کے

ایگزیکٹو انجینئر بن گئے۔اس شعبے سے ڈاکٹر انور سدید ۱۹۸۸ء میں گریڈ ۱۹ میں ریٹائر ہوئے۔ جتنا عرصہ ڈاکٹر انور سدید انجینئر رہے آپ مختلف علاقوں میں رہائش پذیر رہے۔ آپ ایک نہایت ایماندار افیسر تھے۔محکمے کی طرف سے آپ کو گاڑی اور گھر وغیرہ ملا کرتا لیکن بلا ضرورت کسی چیز کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ گاڑی کا استعمال بھی دفتری امور کے لیے ہی کیا جاتا تھا۔ کبھی کسی ذاتی کام کے لیے گاڑی استعمال نہ کرتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید کے بڑے صاحبزادے اپنے والد کی ایمانداری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سرکاری کام کے لیے جیپ ہوتی تھی وہ بھی اس وقت استعمال ہوتی جب دورے پر جانا ہوتا ورنہ ڈرائیور آتا جیپ صاف کرتا حکم کا انتظار کرتا کب بلاو آئے اور وہ جیپ لے کر دفتر جائے۔ابا جی تو پیدل سائیکل پر دفتر جا چکے ہوتے۔ سرکاری اور ذاتی امور میں وہ بے جا اخراجات کے عادی نہ تھے۔۳۲

ڈاکٹر انور سدید اپنے ساتھ اپنی کالونی میں رہنے والے لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کی مثال اس بات سے لی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی کالونی میں موجود پھل دار درختوں کے پھل تمام گھروں میں برابر تقسیم کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ یہاں تک کہ جس کے حصے میں کم پھل آتے ہیں اس کو اپنے حصے سے پورا کرتے تھے۔

ایک اور جگہ ان کے بیٹے لکھتے ہیں:

> اس بڑی کالونی میں پھل دار درختوں کی بہتات تھی۔ ہر صبح موسمی پھل ہمارے بنگلے کے باہر پہنچ جاتے۔ان کا وزن اور گنتی ہوتی۔ابا جی سولہ ہیٹ پہن کر کھڑے ہوتے۔ ایس ڈی سی (کلرک) جیب سے پرچی نکالتا اور کالونی میں رہنے والے سب سے بڑے افسر جو ابا جی تھے ان سے لے کر سب سے چھوٹے رتبے کے مکین جو کالونی کا خاکروب تھا سب کا نام بولتا۔ابا جی مقدار بولتے اور بیدار تولنے والے پھلوں کو تول کر اور گننے والے پھلوں کو گن کر ڈھیریاں بناتا جاتا۔آخر میں تولنے والے کی کوتاہی سے کمی بیشی ہو جاتی تو ابا جی کی ڈھیری سے پوری کی جاتی... یہ لاہور کی شرقی حصے

میں واقعہ آر بی نہر کے کنارے ''بیدیاں'' نہر کالونی کا ہر روز صبح کا معمول تھا۔۳۳

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید حد درجہ مساوات کے قائل تھے۔ان کی نظر میں بڑے افسر سے لے کر خاکروب تک سب برابر تھے۔ کبھی کسی اصول پر سمجھوتا نہ کیا۔یہی وجہ تھی کہ سب ان کی بہت عزت کرتے۔ محکمہ نہر سے ۱۹۸۸ء میں آپ باعزت ریٹائر ہو گئے۔ ملازمت ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کا ایک پہلو تھا۔اس لیے اگر کہا جائے کہ انجینئرنگ آپ کا پیشہ اور اردو ادب آپ کا عشق تھا تو یہ بات بے جا نہ ہو گی۔

اپنے عشق کی آپ بیاری کے لیے انجینئرنگ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے اردو ادب کی تعلیم بھی حاصل کی۔بظاہر انجینئرنگ اور ادب میں زمین وآسمان کا فرق تھا لیکن انور سدید نے دونوں میں کامیابیاں اپنے نام کیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے ایم اے اردو کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پرائیوٹ طالب علم کی حیثیت سے درجہ اول میں پاس کیا۔۱۹۷۹ء میں مقالہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس کتاب پر ان کو ''ہجری ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

ابتداً ادب کا ذوق ان کے اندر ان کے استاد مولوی پیر بخش نے اجاگر کیا جنھوں نے ان کو لائبریری کا انچارج بنایا۔اس وجہ سے ڈاکٹر انور سدید کو بہت سی کتابوں کے مطالعے کا موقع ملا۔

اس کے علاوہ ان کے بڑے بھائی معراج الدین نے ہوم لائبریری بنا رکھی تھی۔اس میں راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد، خواجہ حسن نظامی اور دیگر معروف ادبا کی کتابیں تھیں یہاں سے بھی ڈاکٹر انور سدید اپنے ادبی ذوق کی آبیاری کرتے۔

ادب سے ڈاکٹر انور سدید کی محبت ڈاکٹر وزیر آغا سے ملنے کے بعد عشق اور جنوں میں بدل گئی۔ڈاکٹر وزیر آغا کی راہنمائی میں ہی آپ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے سب سے زیادہ فیض ڈاکٹر انور سدید نے اٹھایا تو بے جا نہ ہو گا۔ مسرت شاہین انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا کے تعلق پر لکھتی ہیں:

آغا صاحب کی صحبت سے سب سے زیادہ فیض یاب انور سدید ہوئے۔ سنجیدہ اور علمی کتب سے ان کی دلچسپی آغا صاحب کی ترغیب ہوئی۔ جب انھوں نے شگفتہ نما تبصرے لکھنے کا آغاز کیا تو آغا صاحب انہیں پڑھ کر عش عش کر اٹھے گویا ان کی ادبی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب انھوں نے تحقیق وتنقید کا انتخاب کیا تھا۔ جب ان کا مضمون ''مولانا اصلاح الدین احمد کا اسلوب'' اوراق میں چھپا تو آغا صاحب پڑھ کر دنگ رہ گئے۔ گویا یہ ان کا پہلا دقیع مضمون قرار پایا یہ مضمون ان کے عشق کی ابتدا تھی۔۳۴

یوں دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر انور سدید ادب کی دنیا میں ایک کے بعد ایک میدان سر کرتے گئے۔ ادب میں شاید ہی کوئی صنف ہو جس کو ڈاکٹر انور سدید نے کامیابی سے برتا نہ ہو۔

ان کی خدمات بحیثیت محقق، نقاد، مزاح نگار، کالم نگار، سفر نامہ نگار، شاعر، تبصرہ نگار، مترجم اور افسانہ نگار قابل قدر ہیں۔ انھوں نے ۸۰ سے زائد علمی وادبی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں تاریخ ادب اردو پر تین کتابیں تحریر کیں۔

۱۔ اردو ادب کی تحریکیں ۱۸۷۹ء

۲۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ۱۹۹۲ء

۳۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ ۱۹۹۰ء

اس کے علاوہ کلاسیکی شعرا پر :

۱۔ میر انیس کی اقلیم سخن، رائٹرز گلڈ الہ آباد (بھارت) ۱۹۸۵ء

۲۔ میر انیس کی قلم رو، لاہور ۱۹۸۹ء

۳۔ غالب کا جہاں، ملتان ۱۹۸۹ء

تنقید کے میدان میں ڈاکٹر انور سدید نے بے شمار کتابیں لکھی۔ جن میں چند ایک یہ ہے:

۔ فکر وخیال ۱۹۷۱ء

۔ اختلافات ۱۹۷۵ء

۔ کھردرے مضامین ۱۹۸۹ء

- اردو افسانے کی کروٹیں ۱۹۹۲ء
- جدید اردو ادب کے ارباب اربعہ ۲۰۰۷ء
- مولانا اصلاح الدین احمد، ایک مطالعہ ۱۹۹۰ء
- وزیر آغا ایک مطالعہ ۱۹۸۵ء
- اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش ۱۹۸۳ء
- انشائیہ اردو ادب میں ۱۹۸۵ء
- اردو ادب میں سفر نامہ ۱۹۸۹ء
- محترم چہرے ۱۹۸۲ء
- غالب کے نئے خطوط ۱۹۸۲ء
- قلم کے لوگ ۱۹۹۲ء

اس کے علاوہ بہت سی کتابوں کے تراجم بھی کیے اور دیگر بہت سی تحقیقی وتنقیدی کتب بھی لکھیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات کو سہراتے ہوئے ان کو بہت سے اعزازت سے بھی نوازا گیا۔ان میں بہترین کالم نگاری پر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی ایوارڈ (A.P.N.S Award)

- کتاب ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' پر رائٹرز گلڈ ایوارڈ
- مقالہ ''اردو میں حج ناموں'' پر نقوش ایوارڈ
- تمغہ امتیاز صدر پاکستان ۲۰۰۸ء

ڈاکٹر انور سدید نے اپنی پوری زندگی ادب کے لیے وقف کر رکھی تھی۔یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔اپنی زندگی میں ادب کی جتنی خدمات انھوں نے کی وہ ادب کے ساتھ ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ڈاکٹر انور سدید کوئی نام نہیں بلکہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ڈاکٹر مسعود ادب سے ان کی محبت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> دفتری امور کی بجا آوری کے لیے ابا جی کو ہفتے میں ایک بار لاہور جانا ہوتا تھا۔ جب وہ واپس آتے تو کتابوں کا ڈھیر ان کی جیپ سے برآمد ہوتا۔ بیدیاں کالونی میں ان دنوں بجلی نہیں آتی تھی۔اماں ہر شام ان کے لیمپ کا شیشہ صاف کرواتی اور مٹی کا تیل بھر کے ان کے مطالعے کے لیے تیار

کروا کے رکھ دیتیں۔ مغرب کے بعد کھانا کھا کریم ہم تو سو جاتے اور ابا جی میز کرسی پر لیمپ کی روشنی میں مطالعہ شروع کر دیتے۔ جب ہم صبح اٹھتے تو پھر میز کرسی پر مطالعے میں مصروف پاتے۔ ایک عرصے تک رہن سہن یہی رہا کہ ابا جی سوتے نہیں ہیں یا تو وہ دفتر کا کام کرتے ہیں اور کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان کا یہ معمول سوائے آخری چند پرسوں کے ہمیشہ یہ ہی رہا۔۳۵

ڈاکٹر انور سدید نہ صرف خود لکھتے بلکہ دوسروں کی لکھنے میں حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔ شاید ہی ادب کی دنیا کا کوئی ادیب ہو جس کے کام سے وہ لاعلم ہوں۔ ادب دوستی کا یہ عالم تھا کہ وہ صرف پاکستان بلکہ بھارت کے ادیبوں کے کام پر بھی ان کی برابر نظر رہتی تھی۔

جہاں ڈاکٹر انور سدید کا نام اردو میں بحیثیت محقق، نقاد، کالم نگار، افسانہ نگار، شاعر اور انشائیہ نگار کے ہمارے سامنے آتا ہے وہیں ان کا ایک اور بہت بڑا حوالہ مکتوب نگاری کا بھی ہے۔ ادبی رسائل پڑھنے والے قارئین اس بات کے یقیناً گواہ ہوں گے کہ ڈاکٹر انور سدید تمام ادبی رسائل کو مکاتیب لکھا کرتے تھے اور ان مکاتیب کو بڑے اہتمام کے ساتھ رسائل میں شائع کیا جاتا تھا۔

منور عثمانی ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہم انور سدید اردو کے ان معدودے چند مصنفین میں ضرور پائیں گے جنھوں نے کسی ماندگی وقفے کے بغیر ایک طویل تصنیفی زندگی گزاری اور متعدد زاویوں سے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کے بغیر انجام دیں۔ انور سدید کی تخلیقی زندگی کے بہت سے زاویے ہیں۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں افسانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ غالباً آخری افسانہ ۱۹۷۰ء میں لکھا۔ شاعری بھی کی، آخری غزل مارچ ۲۰۱۶ء کے الحمرا میں شائع ہوئی۔ (مارچ ۲۰۱۶ء میں ان کا ماہِ وفات ہے) انشائیے لکھے، اردو انشائیے کا سخت ترین ناقد بھی اردو کے پانچ بہترین انشائیہ نگاروں میں انور سدید کو ضرور شامل کرے گا۔ وہ ذاتی، ادبی، رسالہ جاتی

مکاتیب لکھنے میں بھی بدطولیٰ رکھتے تھے۔اگر فقط ادبی رسائل میں شائع شدہ ان کے مکاتیب جمع ہو کر سامنے آجائیں تو دو باتیں پایہ ثبوت کو پہنچ جائیں گی: ایک یہ کہ ادبی یا رسالہ جاتی مکاتیب لکھنے میں انور سدید کا کوئی بدل نہیں، دوسرا یہ کہ کئی ملکوں میں پھیلی اردو کی ادبی فضا اور پیچ در پیچ فکری اور فنی صورتحال میں اتنی بھرپور، اتنی طویل اور اتنی گہری شرکت کی اور اس کی بات کی۔۳۶

منور عثمانی کی یہ رائے واضح کرتی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید ادب کی دنیا کا وہ جگمگاتا دیا تھا جس سے ادب اردو ادیب دونوں فیض یاب ہوئے۔ادب کی تمام اصناف میں لکھا اور بھرپور لکھا اور ان سب کے ساتھ ساتھ مکتوب نگاری میں بھی ڈاکٹر انور سدید کو کمال حاصل تھا۔

آخری عمر میں بڑھاپے کی وجہ سے ڈاکٹر انور سدید نسیان کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی بینائی بھی تقریباً ختم ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ تھوڑا تھوڑا سہی لیکن کاغذ قلم کے ساتھ اپنا رشتہ باندھے ہوئے اور اس بات کا ثبوت رہے کہ مارچ ۲۰۱۶ء میں جب انور سدید کا انتقال ہوا تو اس مہینے بھی ان کی غزل الحمرا میں چھپی حتی کہ ۲۰ مارچ کو (انور سدید کی وفات کا دن) ان کا کالم نوائے وقت میں چھپا۔

ڈاکٹر عابد خورشید ان کے آخری دنوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

ڈاکٹر انور سدید ہر گزرتے لمحہ کا قرض اپنے قلم کے ساتھ اتارنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔کہیں عجیب بات ہے کہ ۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء کو ان کی وفات ہوئی، اس روز بھی ان کا کالم نوائے وقت میں شائع ہوا۔مارچ ۲۰۱۶ء میں شائع ہونے والے ادبی رسائل خاص طور پر تخلیق، الحمرا اور نوائے وقت ایڈیشن میں ان کے مضامین شائع ہوئے۔آخر آخران کی ایک آنکھ سے بینائی ختم ہو چکی تھی اور دوسری آنکھ سے بھی انہیں محدب عدسے کی مدد سے دکھائی دیتا تھا۔اس کے باوجود ان کے دن کا بیشتر حصہ لکھنے پڑھنے میں بسر ہوتا۔۳۷

آخر وہ شخص کہ دنیا جس کو ڈاکٹر انور سدید کے نام سے جانتی ہے ۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء کو بھرپور ادبی زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔

الغرض ادب کی دنیا میں مکتوبات کا اپنا ایک خاص مقام ہے جس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔مکتوبات ہی وہ واحد ذریعہ ہیں جن میں کسی بھی ادیب کی ذات کا عکس صاف اور شفاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔یہ کسی بھی ادیب کے داخل تک رسائی دیتے ہیں۔اردو ادب کی دنیا میں مکتوب نگاری کا عمل بھی آغاز سے ہی ملتا ہے۔ابتدا میں مکتوبات فارسی کے زیر اثر تھے اور ان میں رفیق القاب وآداب دکھائی دیتے ہیں۔لیکن غالب نے مکتوبات کو فارسی کے اثر سے آزاد کروایا اور اس طرح یہ روز مرہ مکالماتی اسلوب میں ڈھل گئے۔سرسید احمد خان کے ساتھ مکتوب نگاری کا دوسرا دور شروع ہوا۔اس دور میں مکتوبات زیادہ مقصدیت کے زیر اثر رہے۔اس دور کے نمائندہ لوگوں میں سرسید کے رفقاء جن میں حالی، شبلی، مہدی علی خان، وقار الملک اور اکبر الہ آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔اگلا دور رومانویت کا دور تھا اس دور میں علامہ اقبال، نیا فتح پوری کے مکاتیب ملتے ہیں۔اس کے علاوہ میرا جی، منٹو، ابوالکلام آزاد، یاس یگانہ، جوش ملیح آبادی، راجندر سنگھ بیدی اور فیض احمد فیض کے مکتوبات بھی سرمائے میں گراں قدر حیثیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے بہت سے حوالوں کے ساتھ ساتھ مکتوب نگار کے طور پر بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں اور یہ نکتہ یقینا قابل بیان ہے کہ جتنے مکتوبات رسائل کو ڈاکٹر انور سدید نے تحریر کیے اتنے کسی دوسرے ادیب نے تحریر نہیں کیے ہوں گے۔علم وادب کی خدمت انھوں نے بغیر کسی غرض کے کی اور مرتے دم تک لکھتے رہے اور یہ ہی بات ادب کے ساتھ ان کی والہانہ وابستگی کا ثبوت بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۷

۲۔ شاداب تبسم، ڈاکٹر، اردو مکتوب نگاری، مکتبہ جامع، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷

۳۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، انجمن بک ڈپو، دریاپاگنج، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱۶

۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۹

۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اردو خط نگاری، مشمولہ: خط نگاری (مباحث، روایت اور اہمیت) مرتب سید جاوید اقبال، قصر الادب، حیدر آباد، دسمبر ۲۰۱۵ء، ص ۲

۶۔ ایضاً، ص ۳

۷۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، مکتوب نویسی، مختصر جائزہ، مشمولہ: اردو مکتوب نگاری، مرتب: پروفیسر ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری، شاخِ زریں، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۱

۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۶۲

۹۔ غلام رسول مہر، علم وادب میں خطوط کا درجہ، مشمولہ: خط نگاری، مرتب: سید جاوید اقبال، ص ۱۴۹

۱۰۔ محمد طفیل، اردو خطوط، مشمولہ: نقوش، مکاتیب نمبر، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۸۔۱۹

۱۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اردو خط نگاری، مشمولہ: خط نگاری، ص ۴

۱۲۔ حافظ عماد الدین، تفسیر ابن کثیر مترجم: ضیاالقرآن، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۶۰۱

۱۳۔ خورشید السلام، ڈاکٹر، خطوط نگاری، مشمولہ: اردو نثر کا فنی ارتقا، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۹۸۔۳۹۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۰۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۰۱۔۴۰۲

۱۶۔ شاداب تبسم، ڈاکٹر، اردو مکتوب نگاری، ص ۴۱

۱۷۔ رجب علی بیگ سرور، خط، مشمولہ: انشائے سرور، مرتب: احمد علی، مرزا، مطبع نول کشور، لکھنو، ص۱۹

۱۸۔ کوکب قدر سجاد علی، واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص۵۲۶

۱۹۔ رشید احمد صدیقی، مضمون، مشمولہ: نگار، لکھنو، جولائی ۱۹۴۰ء، ص۱۸۔۱۹

۲۰۔ غلام رسول مہر، ذکر غالب، دہلی، ۱۹۶۴ء، ص۲۸۰

۲۱۔ غالب (خط) بنام میر مہدی مجروح: مشمولہ: اردوئے معلیٰ، مرتب، مرتضیٰ حسین فاصل، جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء، ص۳۱۳

۲۲۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اردو خط نگاری، مشمولہ: نقوش، مکاتیب سر سید احمد خان، مرتب مشتاق حسین، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص۲۱۲

۲۳۔ حالی، مکتوب، مشمولہ: مکاتیب حالی،، مرتب: محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، پیش لفظ، ص۹

۲۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، خطوط کے آئینے میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، اگست ۲۰۰۷ء، ص۲۴

۲۵۔ محمد طفیل، نقوش کا مکاتیب نمبر، سید عبد اللہ، ص۲۹

۲۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، خطوط کے آئینے میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، اگست ۲۰۰۷ء، ص۲۷

۲۷۔ ایضاً، ص۲۸

۲۸۔ ایضاً، ص۳۳

۲۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، خطوط کے آئینے میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، اگست ۲۰۰۷ء، ص۳۵

۳۰۔ ایضاً، ص۳۸

۳۱۔ مسرت شاہین، ڈاکٹر، ڈاکٹر انور سدید، مشمولہ: اسالیب، سرگودھا، شمارہ ۳۲، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶، ص۳۶۔۳۷

۳۲۔ مسعود انور، ابا جی، مشمولہ: انوارِ ادب بیاد ڈاکٹر انور سدید، مقبول اکیڈمی، لاہور، جون ۲۰۱۶، ص۳۴۴

۳۳۔ ایضاً، ص۳۴۴

۳۴۔ مسرت شاہین، ڈاکٹر، ڈاکٹر انور سدید، مشمولہ: اسالیب، سرگودھا، سہ ماہی، شمارہ ۲۳، ۲۰۱۶ء، ص ۳۲

۳۵۔ مسعود انور، میرے ابا جی (ایک نامکمل تعارف)، مشمولہ: انوار ادب، بہار ڈاکٹر انور سدید، مقبول اکیڈمی، لاہور، جو ۲۰۱۶، ص ۳۴۴۔۳۵۴

۳۶۔ منور عثمانی، ہم سب کے انور سدید، مشمولہ: سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، شمارہ ۲۳، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۴

۳۷۔ عابد خورشید، ڈاکٹر، داستان ختم ہوئی، مشمولہ: اسالیب، سہ ماہی، سرگودھا، شمارہ ۲۳، ستمبر تا دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۳۲۔۳۷

باب دوم

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا تجزیاتی مطالعہ

(الف) ڈاکٹر انور سدید کے خطوط کا موضوعاتی مطالعہ:

ڈاکٹر انور سدید ادب کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام ہے۔ایک ایسا نام جو کہ ہر صنف ادب کو کامیابی سے سر کرنے والا تھا۔ دنیا ڈاکٹر انور سدید کو محقق، نقاد، افسانہ نگار، شاعر، مترجم اور تبصرہ نگار کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لیکن ان سب حوالوں کے علاوہ ڈاکٹر انور سدید ایک بہت بڑے مکتوب نگار بھی تھے جنھوں نے تقریباً تمام ادبی رسائل کو خطوط لکھے اور ان مکتوبات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید ادب میں وہ شخص ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ رسالہ جاتی مکاتیب لکھے اور ان میں لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ان کو اچھا اور پر اثر لکھنے کی طرف مائل کیا۔اس لیے اگر کہا جائے کہ ڈاکٹر انور سدید ادب کی دنیا میں ''حوصلے کا استعارہ'' ہیں تو یہ بات بے جا نہ ہو گی۔کیونکہ بہت سے ایسے ادیب ہیں جن کے اندر لکھنے کی تحریک کو ڈاکٹر انور سدید نے جنم دیا۔وہ قدم قدم پر نئے لکھنے والوں کو حوصلہ اور راہنمائی دیا کرتے تھے۔

محمد رفیع ازہر جنھوں نے سرگودھا یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا اور ''ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقیدی جہات'' پر تحقیقی مقالہ لکھا۔انھوں نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ ڈاکٹر انور سدید نے یہ تحقیقی پڑھنے کے بعد ان کی خوب حوصلہ افزائی کی اور ان کو آگے بڑھنے کی راہ دکھائی۔ایک دفعہ محمد رفیع ازہر کو ڈاکٹر انور سدید سے ملنے کا موقع ملا اور اس دوران ڈاکٹر انور سدید سے ان کا تعارف شاکر کنڈان نے کروایا۔ لیکن وہ اس گرم جوشی کے ساتھ ملے کہ محمد رفیع ازہر کو یوں لگا کہ گویا ان کے ساتھ برسوں کی جان پہچان ہو۔ڈاکٹر انور سدید کا یہ انداز ثابت کرتا ہے کہ وہ علم وادب سے لگاؤ رکھنے والوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتے تھے تاکہ یہ لوگ آگے بڑھ کر مزید اچھا کام کر سکیں اور یوں اردو ادب میں نئے لوگ آتے رہیں تاکہ اس خاندان کو وسعت ملے اور یہ ترقی کی راہوں پر گامزن رہے اور اس

سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک نہایت عاجز انسان تھے جو دوسروں کو عزت دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں محمد رفیع ازہر لکھتے ہیں:

> ناگاہ شاکر کنڈان کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فوراً اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید سے راقم کا تعارف کروایا: یہ ہے محمد رفیع ازہر جس نے ڈاکٹر وزیر آغا پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ پھر کیا تھا... ڈاکٹر انور سدید بالا استعیاب راقم کی طرف ملتفت ہو گئے اور ساتھ ہی عام التفات بھی حاصل ہو گئے۔ انھوں نے مقالے کی اتنی تعریف کی... اتنی تعریف کی کہ اتنے سارے بزرگ ادبا اور اساتذہ کے درمیان راقم نہایت شرم محسوس کرنے لگا۔ وہ مزید گویا ہوئے کہ یہ مقالہ تو پی ایچ ڈی سطح کا ہے اور یہ کہ سرگودھا یونیورسٹی کو یہ مقالہ شائع کرنا چاہیے... بعد ازاں فون پر بھی ان سے رابطہ رہا۔ راقم ان کی خیریت دریافت کرتا اور وہ راقم سے اس کے علمی مشاغل دریافت فرماتے رہتے اور ساتھ ساتھ خوب حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ا

ڈاکٹر انور سدید نہ صرف دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کو اچھا لکھنے پر مائل کرتے تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کو اس بات کی ترغیب بھی دیتے کہ وہ اپنے علم کو اشاعت کے مراحل سے گزار کر اس سے دوسروں کو بھی فیض یاب ہونے کا موقع دیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ علم کا فائدہ اس کی اشاعت میں ہی ہے نا کہ اس کو اپنی ذات تک محدود کرنے میں۔ اپنے ایک مکتوب میں وہ محمد رفیع ازہر کو بھی اپنے تحقیقی مقالے کو شائع کروانے کی ہدایت کرتے ہیں اور خود بھی اس سلسلے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

رفیع ازہر کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> سلام مسنون۔ آج مجھے آپ بہت یاد آئے، اور بے پایاں خوشی کے ساتھ ایک صورت ملال کی بھی پیدا ہوئی۔ خوشی اس بات کی کہ آپ کی کتاب تنقیدات وزیر آغا کی متنوع جہات پر یہاں لاہور کے ایک ناشر کے ساتھ بات ہو گئی تھی اور میں نے اس کی یہ شرط بھی قبول کر لی تھی کہ وہ اس کتاب کی اشاعت پر ہمیں نقد رائلٹی کے بجائے کم از کم ۲۰ نسخے عنایت

فرمائیں گے۔اس دوران میں انہیں مسلسل فون کرتا رہا اور وہ ناشرانہ حربے استعمال کرتا رہا۔ آج انھوں نے یہ بتا کر میرے اوسان خطا کر دیئے کہ کتاب کا مسودہ کمپوزر سے گم ہو گیا ہے۔ آخر کار میرے لیے یہ بات ایک ملال کی ہے کہ اب اس کی اشاعت کا امکان بھی معدوم ہو گیا... تاہم اطمینان یہ ہے کہ کتاب نہ صرف آپ کے پاس محفوظ ہے بلکہ آپ نے دیگر دوستوں کے پاس بھی محفوظ کرا رکھی ہے۔ کیا ان میں سے کسی نے اس کتاب پر تحریری اظہار خیال کیا ہے۔۲

جس طرح ہر اچھا انسان جس شعبے سے وہ منسلک ہوتا ہے اس کی ترقی اس کو خوش اور اس شعبے کی تنزلی اس کو پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے۔اسی طرح ادب کی دنیا سے وابستہ لوگ بھی ادب کے پھلنے پھولنے پر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید بھی بطور مکتوب نگار تمام ادبی رسائل سے منسلک رہتے تھے۔ان کو پڑھنے اور ان پر اپنی آرا دیتے تھے۔کسی بھی ادبی رسالے کا ملنا ان کے لیے بہار کے جھونکے سے کم نہ ہوتا تھا۔لہٰذا جب کبھی کوئی رسالہ ان کو ملتا تو ان کی خوش دیدنی ہوتی تھی۔ڈاکٹر انور سدید ''نالہ دل'' کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:''پہلے آپ کا خط ملا پھر تخلیق نے در دل پر دستک دی۔ گویا پہلے چھوٹی عید آئی پھر بڑی عید آئی۔ (۳) ڈاکٹر انور سدید ادبی رسائل کے ساتھ ہمہ وقت منسلک رہتے تھے۔اس لیے ان کے مکتوبات میں زیادہ تر وہ مکتوبات شامل ہیں جو انھوں نے رسائل کے نام لکھے ہیں۔ان مکتوبات کی حیثیت تجزیاتی اور بعض مقامات پر تنقیدی ہے۔ رسائل میں لکھنے والے ادیبوں کو تنقید کی عینک سے دیکھتے اور ان کو اچھا لکھنے پر شاباش دیتے اور کچھ غلط ہوتا تو بہت ہمدردی کے ساتھ درستی کرواتے۔

ڈاکٹر انور سدید نہ صرف بڑے شہروں کے رسائل کے ساتھ منسلک رہتے بلکہ چھوٹے شہروں کے ادبی پرچوں کو بھی پوری محبت سے پڑھتے اور جواب دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کا تعلق سرگودھا کے ایک گاؤں میانی سے تھا۔یہ گاؤں دریائے جہلم کے کنارے پر اور بھیرہ کے قریب آباد ہے۔ آبائی علاقے سے محبت انسان کے خمیر میں داخل ہوتی ہے۔انسان جتنی ترقی کر لے یا جتنا آگے بڑھ جائے تو آبائی وطن اس کے لیے جنت سے کم نہیں ہوتا۔وہ جہاں بھی جائے

اپنی جائے پیدائش کے ساتھ اس کا تعلق کبھی کمزور نہیں ہوتا اور اس علاقے کی ترقی پر وہ دلی خوشی محسوس کرتا ہے۔اپنے ایک مکتوب میں انور سدید انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> نالہ دل کا اکتوبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ مل گیا ہے۔ اس کرم کے لیے آپ کا شکرگزار ہوں کہ یہ رسالہ میری جنم بھومی سے ہوائے تازہ اور خوشبوئے نوبہار لے کر آتا ہے اور خوشی ہے کہ بڑے شہروں کے ادیب اب اس دور افتادہ شہر کے ادبی رسالے کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔۴

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ادبی رسائل لکھنے والوں کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔جن کی مدد سے وہ اپنی تخلیق کو منظرعام پر لاتے ہیں اور دوسروں کو اپنا شریک بنا لیتے ہیں۔... ادبی رسائل ایک ادیب کے پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اچھا ادبی مجلہ ادیب کو آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے اور ادب کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔انہیں رسائل کی بدولت قارئین کو اچھے لکھنے والوں سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔اگر یہ رسائل نہ ہوتے تو آج یقینا ادب بہت سے ادیبوں سے محروم رہ جاتا۔ڈاکٹر انور سدید نالہ دل میں ادبی رسائل کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ذاتی طور پر میرا یہ موقف ہے کہ تخلیق کاری ہر ادیب کا ذاتی اظہار ہے۔ اور اگر یہ تخلیقی رسائل میں نہ چھپے تو ایسے ہی ہے جیسے کسی کی بیٹی گھر میں بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہو اور اس کے اوصاف کی تحسین کرنے والا شوہر نصیب نہ ہو۔ ادبی پرچہ صدقہ جاریہ ہے۔ ادب کا ناقوس خصوصی ہے۔ ادیب کا تعارف کار ہے۔میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مخزن، زمانہ، ادبی دنیا، ساقی، ہمایوں، ادب لطیف، سویرا، نقوش، افکار، اوراق، تخلیق، الحمرا، فنون اور اب ''نالہ دل'' جیسے رسائل نہ ہوتے تو بے شمار ادیب اپنے تعارف سے محروم رہتے۔۵

مکتوب نویسی ادب میں ایک ایسی صنف ہے جو کہ سند کے طور پر بھی پیش کی جاتی ہے۔ ان کی مدد سے بہت سے نادر معلومات ملتی ہیں۔اب تک شعرا اور نثر نگاروں کی زندگی سے متعلق جتنا پیش قیمت خزانہ ان کے مکتوبات سے ملا دوسرا کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید ادبی

رسائل میں مکتوبات کے حصے کو بہت اہمیت دیتے ہیں کیونکہ مکتوب ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی مدد سے لکھنے والے کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تحریر میں کیا کمی بیشی ہے؟ کس طرح اپنی تحریر کو نکھارا جا سکتا ہے؟ قاری کیا پڑھنا چاہتا ہے اور کس طرح کے ادب کی ضرورت ہے؟

یہ سارے جوابات ادیب کو مکتوبات کا حصہ پڑھ کر ہی مل سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ مکتوب نگار کو اچھا نقاد ہونا چاہیے جو کہ تعصب کی عینک اتار کر وسائل کا مطالعہ کرے اور اس کے بعد اپنی رائے دے۔

ڈاکٹر انور سدید بھی اپنے ایک مکتوب میں اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> اس دفعہ انجمن خیال نے بارہ صفحے لیے ہیں۔چند دن قبل پشاور سے ابلاغ اور راولپنڈی سے غدار اصغر صاحبہ کا رسالہ تجدید ملا تھا۔ان دو پرچوں میں خطوط کا حصہ بے حد منور تھا۔ قارئین نے رسالہ پڑھا اور پڑھ کر آپ کو اپنی رائے بھیجی۔ اختلاف بھی ہوا اور تحسین کے پہلو بھی روشن ہوئے۔ ادب کی کہکشاؤں پر رونق نظر آئی اور یہ امید تازہ ہوئی کہ ضخیم پرچوں کی چکا چوند کے بعد اب ماہانہ ادبی رسائل کا دور پھر آرہا ہے۔اب پھر ایسے رسائل منظر عام پر آئیں گے جو چھپیں گے تو پڑھے بھی جائیں گے اور ردِ عمل بھی پیدا کریں گے۔شاید ادب کی کوئی نئی تحریک جاگ اٹھے۔٦

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں تحریکیں تب ہی جنم لیتی ہیں جب مختلف طبقہ فکر کے لوگ مختلف نظریوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔اس لیے وہ اس بات سے بہت خوش ہوتے تھے کہ ادبی رسائل کے قارئین نہ صرف ان رسائل کی ورق گردانی کریں بلکہ ادیبوں کی تخلیقات پر اپنا نکتہ نظر بھی واضح کریں۔ ڈاکٹر انور سدید کا خیال ہے کہ جب کوئی شخص کسی بھی تخلیق پر اپنی رائے دے تو اس کو لکھ کر دینی چاہیے تاکہ وہ محفوظ ہو اور بعد میں آنے والی نسل بھی ان نادر باتوں سے مستفید ہو سکے۔ اسی طرح ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک اور مکتوب میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس طرح کے تجزیاتی خطوط پڑھنے والوں کو روشنی فراہم کرتے ہیں اور نئے لکھنے والے ان سے مزید اچھا سبق لیتے ہیں۔میں معذرت سے عرض کرتا ہوں کہ بیشتر خطوط نگاروں نے تنقیدی یا تجزیاتی عمل سے کام نہیں لیا محض

رسمی خط لکھے ہیں۔ خطوط کے اس حصے میں سابقہ پرچے کے مضامین پر بحث استوار ہونی چاہیے۔ قارئین کو اس طرح متوجہ کیجیے:

نالہ دل میں بانو قدسیہ صاحبہ کا خط دیکھ کر مجھے بے پایاں خوشی ہوئی۔ یہ ان کی عظمت ہے انھوں نے نالہ دل اور آپ کی ادبی خدمت کی تحسین کی۔ ان کی رائے ایک ہزار فنون کالوں سے زیادہ قیمتی ہے اور ہوا میں اڑ جانے کے بجائے محفوظ ہو گئی ہے۔۷

انور سدید کی رائے میں اگر بانو قدسیہ صاحبہ اپنی رائے فون پر دیتی تو وہ محفوظ نہ ہو سکتی۔ بلکہ وہ ضائع ہو جاتی۔ اسی لیے وہ چاہتے کہ تمام ادیب اپنی تحریری آرا رسائل کو بھیجا کریں تا کہ وقت پڑھنے پر ان سے استفادہ کیا جا سکے۔

بحیثیت ادیب اچھی کتاب سے محبت ڈاکٹر انور سدید کے ہاں ملتی ہے۔ جب کبھی ڈاکٹر انور سدید کو کسی نئی اور اچھی کتاب کی اشاعت کے بارے میں معلوم ہوتا تو وہ اس کو پڑھنے کے لیے بے قرار ہو جاتے اور اس کو حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر انور سدید نے ابوالمعانی عصری کی کتاب ''ایوان غزل'' کے بارے میں سنا اور اس پر مختلف اخباری تبصرے بھی پڑھے۔ ان تبصروں کو پڑھنے کے بعد ان کے اندر کتاب کو پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔

اسی خواہش کا اظہار وہ ابوالمعانی عصری کے نام ایک مکتوب میں کرتے ہیں:

آپ کے کرم نامے کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ میں اکتوبر میں کوٹ ادو آگیا تھا اور تاحال یہاں ہوں۔

ایوان غزل مجھے تاحال نہیں پہنچی۔ اخبارات میں تبصرے دیکھے۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ یہ اچھی کتاب ہو گی۔ آپ بھجوا سکیں تو بڑا کرم ہو گا۔۸

ڈاکٹر انور سدید نہ صرف خود اچھی کتاب کے حصول کے لیے کوشاں رہتے بلکہ یہ چاہتے کہ نوجوان نسل بھی کتاب سے محبت کرے۔ ان کے اندر بھی کتب بینی کا شوق پیدا ہو۔ کیونکہ یہ ہی شوق کسی بھی قوم کی ترقی کا ضامن بن سکتا ہے۔ وہ قومیں جو کتابوں کو دوست بناتی ہیں وہ بہت جلد ترقی کی منازل طے کرتی ہیں۔

اس سلسلے میں وہ تعلیمی اداروں میں موجود کتب خانوں کو بہت اہمیت کا حامل گردانتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ تعلیمی اداروں میں موجود اساتذہ کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ طلبہ میں کتب بینی کا شوق اجاگر کریں۔ان کو اچھی کتاب کی طرف راغب کریں تاکہ ہمارے معاشرے میں اچھے افراد پیدا ہو سکیں۔لیکن ہماری درسگاہوں میں اساتذہ اپنی ذمہ داریوں سے دور بھاگتے ہیں۔ان کو طلبہ سے دلچسپی کے بجائے اپنے عہدوں اور تنخواہوں کا خیال ہے۔کتب بینی سے دوری کی ایک بڑی وجہ کتاب کا قاری کی پہنچ سے دور ہونا اور کتاب کا مہنگا ہونا ہے۔انہی خیالات کو ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مکتوب میں بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لائبریریاں موجود ہیں، کتابوں کی۔ طباعت واشاعت میں بھی کوئی کمی نہیں آئی لیکن بقول نالہ دل محلہ چمکتی ہوئی کتابیں لائبریریوں کی خوب صورت اور قیمتی تالہ بندیوں میں اپنی محبوس زندگی کا موت جیسی خاموشی سے احتجاج کرتی ہیں... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے طلبہ کو کتاب دوست نہیں بنایا۔ان کے دل میں اچھی کتاب کے مطالعے کا ذوق پیدا نہیں کیا۔دوسری طرف ناشر کتاب چھاپتا ہے اور اس کی قیمت اتنی زیادہ رکھتا ہے کہ تنگ دست قاری خرید ہی نہیں سکتا۔یہ مہنگی کتابیں سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو فراہم کی جاتی ہیں اور اس خریداری پر ناشر بڑی شرح پر کمیشن پیش کرتا ہے۔تعلیمی اداروں میں اس قسم کی کرپشن عام ہے۔لیکن نقصان یہ ہے کہ طلبا کے ادبی ذوق کو نہ سنوارا جاتا ہے اور نہ اچھی کتاب سے اسے متعارف کرایا جاتا ہے۔۹

اب ہماری قوم علمی زوال کے دور سے گزر رہی ہے اور اس زوال کی سب سے بڑی وجہ کتاب سے دوری ہے۔ہم نے اپنی نسلوں کو کتاب سے دور کر دیا ہے اور وہ دیگر مشاغل میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔جن میں ان کے لیے فائدے کی بجائے نقصان ہی ہے۔ہم نے اپنے بچوں کو کتاب دوست نہیں بنایا اس لیے تو کتاب دوستی بھی زوال کی زد میں ہے۔ڈاکٹر انور سدید جہاں قوم میں علمی زوال کی بات کرتے ہیں وہیں وہ اس زوال کی وجوہات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ کتاب دوستی، کتابوں کا مہنگا ہونا، اساتذہ کی

عدم دلچسپی وغیرہ جیسی وجوہات اپنے ایک اور مکتوب میں بھی وہ اسی المیے کی طرف توجہ کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اداریے میں یہ سوال بڑی درمندی سے اٹھایا گیا ہے کہ علم ودانش تو جیسے ہمارے معاشرے سے اٹھ سی گئی ہے اور سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے سٹاف رومز میں علم وادب کی بجائے تنخواہوں، قرضوں، پرموشنوں اور گریڈوں کے قصے چھیڑے جاتے ہیں اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ہندو پاک کی دانشگاہیں علم سے خالی ہو گئی ہیں۔۱۰

ان الفاظ میں ڈاکٹر انور سدید کے لہجے میں انتہائی دکھ اور کرب کی کیفیت محسوس کی جاتی ہے اور امید کی کرن دکھائی نہیں دیتی کیونکہ اساتذہ اور طلبہ کا تعلق سرمایہ کارانہ نظام کی نظر ہو چکا ہے۔اب مقصد علم کا حصول نہیں ہے بلکہ ڈگری حاصل کر کے اچھی نوکری کی ضرورت مقصد بن چکا ہے اور یہ ہی علم وادب کے زوال کی اصل وجہ ہے۔

ادب زندگی کی مستقل قدروں کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے۔ادب زندگی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے جس میں قاری کو اپنی خامیاں اور کوتاہیاں واضح ہوتی نظر آتی ہیں۔ادیب جو اس سارے ادبی مواد کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے۔اس کی ذات معاشرے کے لیے مفید وکارآمد ہوتی ہے۔ادیب معاشرے کا نبض شناس ہوتا ہے۔معاشرے کے مسائل، لوگوں کے دکھ سکھ ان سب کو ایک ادیب ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے سامنے لاتا ہے۔یوں ادیب کی ذات اہم ترین ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں شاید ادب کی تو عزت کی جاتی ہے لیکن ادیب کو وہ جگہ وہ مقام نہیں مل پاتا جس کا وہ حق دار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ایک درد شناس دل رکھنے والے بلند پایہ ادیب ہیں۔جو ہمیشہ ادب اور ادیب کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور معاشرے میں ادیب کو عزت کا مقام دلانے کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔وہ ادب کے لیے ہمدردانہ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔اپنے مکتوبات میں بھی وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آخر میں یہ افسوس ناک خبریں سن لیجیے کہ راولپنڈی میں مصروف افسانہ نگار شمس نعمان فوت ہو گئے، لاہور میں ایک جواں عمر شاعر غضنفر علی ندیم وفات پا گئے، وہ حلقہ تصنیف ادب میں مشاعرہ میں شامل تھے۔ اٹھ کر کمرے میں گئے تو وہیں برین ہیمبرج ہو گیا، تین چار دن بعد اس دنیا کو ہی چھوڑ گئے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ انہیں علاج معالجے کی سہولتیں بھی میسر نہ آئیں۔ جبکہ پچھلے دنوں اشتہاری شہرت سے نام کمانے والے ایک کالم نگار بیمار ہوئے تو گورنر پنجاب انہیں گلدستہ پیش کرنے کے لیے ہسپتال گئے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب نے ان کی عیادت کے لیے اپنا خاص ایلچی بھیجا، جس نے ان کو پھول پیش کیے۔ عرض کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ سرکار کے کھاتے میں کیا ادیبوں کے لیے بھی ذات پات اور امیر غریب کی تمیز قائم ہے۔11

اپنے اس مکتوب میں ڈاکٹر انور سدید نے حکومتی رویے پر شدید تنقید کی ہے جو ادیبوں کی سر پرستی نہیں کرتی نہ ہی مشکل حالات میں ان کا ساتھ دیتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ طنز بھی ہے کہ کچھ خاص ادیب جو حکومتی نقطہ نظر کو فروغ دینے والے اور حکومتوں کے ساتھ اپنی وفاداریاں دکھاتے ہیں اور حکومتوں کے بدلنے سے ان کی وفاداریاں بھی بدل جاتی ہیں ایسے لوگوں کو ہی حکومت سے فائدہ ملتا ہے۔

دوسری طرف حقیقت پسند اور ادب شناس لوگ جو کہ ادب کی اصل خدمت کرنے والے ہوتے ہیں ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا چاہے وہ مر جائیں یا زندہ رہیں۔ حکومت کی اس زیادتی پر کبھی بھی احتجاج نہیں کیا جاتا اور جو کرتا ہے اس کے خلاف بھی رد عمل ہونے لگتا ہے۔

کئی ادارے جن کو لاکھوں کی گرانٹیں ملتی ہیں وہ بھی کبھی ادیبوں کے حق کے لیے آواز بلند نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی ایسی پالیسی مرتب کرتے ہیں جن کی مدد سے ان کا مستقبل محفوظ کیا جا سکے۔ اسی حقیقت کو ڈاکٹر انور سدید اپنے مکتوب میں بیان کرتے ہیں:

پچھلے دنوں لاہور میں خبر گرم تھی کہ ایک معروف بوڑھے شاعر کی صدر مملکت نے اس کے مقام اور مرتبے کے مطابق پذیرائی نہیں کی بلکہ بعینہ

طور کاغذ کا ایک پرزہ بھیج کر اشک شوئی کر دی۔ لاہور سے اس رویے پر صرف اظہر جاوید نے احتجاج کیا، سنا ہے کہ شاعر موصوف الٹا، اظہر جاوید سے ناراض ہو گئے ہیں اور انہیں ایک نوٹس بھی بھیج دیا ہے۔ بہت عرصہ پہلے اکادمی ادبیات پاکستان نے ادیبوں کی بیمہ سکیم جاری کی تھی، کچھ ادیبوں کو پالیسی کے کاغذات بھی بھجوا دیئے تھے۔ لیکن پھر یہ سکیم خدا جانے کہاں چلی گئی۔ اب خوف ناک صورت یہ ہے کہ جب کوئی ادیب غربت اور ناداری کی حالت میں مرتا ہے۔ تو ہم اس کے بچوں کی کفالت کے لیے اپیلیں کرنے لگتے ہیں۔ کیا صدر مملکت کا فرض نہیں کہ دو چار بڑے ادیبوں ہی کی پذیرائی نہ کریں بلکہ ادب کے ہر خدمت گزار کو جو علالت اور بیماری کا شکار ہے کم از کم علاج کی سہولت تو فراہم کریں۔ ۱۲

ڈاکٹر انور سدید اس بات کی خواہش کرتے تھے کہ حکومت کو لازمی طور پر کچھ پالیسیاں مرتب کرنی چاہییں جن کے ذریعے سے ادیبوں کی مدد ہو سکے۔ ان کو علاج معالجے کی سہولیات دی جانی چاہیں تا کہ ان کو محتاجی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

کسی بھی مخصوص شعبے کے لوگ مل جائیں تو ایک چھوٹی سی سوسائٹی کی مانند بن جاتے ہیں اور اس میں رہنے والوں پر لازم ہو جاتا ہے وہ اپنی اس سوسائٹی میں موجود دیگر لوگوں سے باخبر رہیں۔ ان کے دکھ سکھ میں ان کا ساتھی بن کر مدد کریں۔ کیونکہ دوسروں سے بے خبر رہنا اخلاقی اصولوں کے بھی منافی ہے۔ یہ ہی حال ادب کی دنیا کا ہے۔ تمام ادیب ادب کی مخصوص سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کے مطالعے پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک درد مند دل رکھنے والے شخص تھے۔ جو کہ ادبی حلقے سے ممکنہ حد تک باخبر رہتے تھے۔ دوسروں کی خوشی میں خوش اور دکھ میں دکھی ہوتے۔ اگر کوئی بیمار ہوتا تو اس کے لیے پریشان ہوتے اور اس کے لیے دعائیہ کلمات ادا کرتے۔

منصور قیصر جو کہ راولپنڈی سے تعلق رکھتے تھے ان کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

منصور قیصر راولپنڈی میں بیمار پڑا ہے۔ کیا زندہ دل نوجوان تھا جسے بیماری نے آلیا۔ سنا ہے کہ جب اس پر بیماری نے حملہ کیا تو وہ احمد فراز پر مضمون لکھ رہا تھا۔ خدا اسے تادیر سلامت رکھے، میں نے اسے خط لکھا تھا۔ جواب نہیں آیا۔ گزشتہ تخلیق میں اس نے جو مضمون لکھا ہے اس سے بڑی مایوسی کا اظہار ہوتا تھا۔ ۱۳

اپنے ایک اور مکتوب میں ڈاکٹر عبدالحق کا سنگجوی، ڈاکٹر سلیم اختر اور وہاب اشرفی کا ہمدردانہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر عبدالحق کا سنگجوی کا خط پڑھ کر فکر مندی ہوئی کہ وہ بیماری کی حالت میں گر پڑے اور ان کی دونوں آنکھوں میں اندرونی چوٹیں آئیں، لکھنے پڑھنے والوں کے لیے آنکھیں متاع گراں مایہ ہیں کہ ان سے دانشور ان عالم سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ڈاکٹر کا سنگجوی صاحب ادب کے مخلص خدمت گزار ہیں۔ میں ان کی صحت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ ان دنوں لاہور میں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب بھی علیل ہیں۔ بھارت میں ڈاکٹر وہاب اشرفی وفات پا گئے۔ ۱۴

درجہ بالا اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اپنے ارد گرد سے باخبر رہتے تھے۔ ادبی حلقہ ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ پاکستان کے ہر کونے میں رہنے والے ادیبوں سے باخبر رہتے۔ نہ صرف پاکستان کو بھارت کے ادیبوں سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں ایک اورچیز جو ملتی ہے اس کی جڑیں نفسیاتی تنقید کے ساتھ جا ملتی ہیں۔ نفسیاتی تنقید میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی بھی فن پارے کو جب جانچا جائے تو اس کو جانچنے کے لیے اس فن پارے کے خالق کی شخصیت کی کلی تفہیم بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں یہ دیکھنا لازمی ہے کہ:

۱۔ تخلیق کار کے لاشعور میں کیا کچھ موجود ہے؟

۲۔ کیا اس کو کسی ناآسودگی کا سامنا تو نہیں؟

۳۔ اگر ایسا ہے تو اس کے پیچھے کیا محرکات کارفرما ہیں؟

۴۔ بحیثیت انسان وہ کیسا ہے؟

۵۔ اس کا لوگوں کے ساتھ رویہ کیا ہے؟

۶۔ اگر کسی تخلیق کار میں کوئی جسمانی یا ذہنی نقص ہے تو اس کا کیا سبب ہے؟

نفسیاتی تنقید میں ان سارے سوالات کا جواب لینا ضروری ہے اور ان کی روشنی میں ہی تخلیق کار کی تخلیق کا منصفانہ جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ انگارے کے مدیر نے لکھا کہ ''انگارے میں مسائل پر تو کھل کر بات کی جا سکے گی لیکن شخصیات زیر بحث نہیں آئیں گی۔''(۱۵) ڈاکٹر انور سدید نے اس بات پر اعتراض کیا کہ شخصیات کے بغیر مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔

انگارے کی اسی پالیسی پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے:

> تاہم آپ نے شخصیات کی وضاحت نہیں کی کیونکہ فروری کے پرچے میں سجاد ظہیر کا ناول لندن کی ایک رات زیر بحث آیا تو اس میں سجاد ظہیر کو مورد تنقید و تنقیص بھی بنایا گیا اور انہیں فراری بھی شمار کیا گیا جو مصنف کی اپنی رائے تو ہو سکتی ہے لیکن سب اہل قلم ان سے متفق نہیں ہو سکتے۔ دوسرے ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر صاحب کا ایک خاص کردار تھا جسے انھوں نے نظریاتی راسخیت سے پورا کرنے کی کوشش کی، حتی کہ جب انہیں پاکستان میں کمیونزم کے مشن پر بھیجا گیا تو وہ پارٹی کے حکم کی تعمیل میں اس نوزائیدہ ملک میں آئے اور زیر زمین رہ کر کام کرتے رہے اور راولپنڈی سازش کیس میں قید وبند کے آزار سے بھی گزرے۔ حال میں مصروف ترقی پسند ادیب احمد بشیر نے انکشاف کیا ہے کہ سجاد ظہیر کو پاکستان میں اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ پاکستان کو آزادی کے برعکس دونوں ملکوں کو پھر متحد کرنے کے لیے کام کریں۔اس کا جواب ماہنامہ ''نیاز نامہ'' میں حمید اختر صاحب نے دیا ہے اور احمد بشیر کی تردید کی ہے... اس بحث

سے سجاد ظہیر کا نام نکال دیا جائے تو بات آگے کیسے چلے گی اور قاری اپنا منصفانہ فیصلہ کس طرح کر سکے گا۔۱۶

اس تمام بحث سے ڈاکٹر انور سدید کا یہ نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تخلیق اور تخلیق کار کو الگ نہیں کرتے بلکہ کسی بھی تخلیق کا مطالعہ کرنے کے لیے تخلیق کار کے حالات وواقعات سے واقفیت کو ضروری گردانتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ادیب، ادیب بعد میں ہے پہلے وہ ایک انسان ہے۔ایسا انسان جو کہ معاشرتی قوانین وضوابط سے مبرئ نہیں ہے۔باقی شہریوں کی طرح اس کے بھی حقوق وفرائض مقرر ہیں جن سے روگردانی ناممکن ہے۔ اسی طرح ادب بھی اسی معاشرے میں پیدا ہوتا ہے اسی لیے اس کا معاشرتی حالات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ انہیں خیالات کا اظہار اس مکتوب میں ملتا ہے۔جب انور سدید لکھتے ہیں کہ:

یہ بات عرصہ ہوا طے پا چکی ہے کہ ادیب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔اولاً وہ کسی ملک کا ذمہ دار شہری ہے۔ اگر اس حیثیت میں تہذیبی اور اخلاقی تقاضوں کے خلاف کوئی حرکت کرتا ہے تو وہ قابل گرفت ہے۔اس کی دوسری حیثیت ایک ادیب کی ہے اور اس حیثیت میں وہ ادب کے پیمانوں پر ہی پرکھا جائے گا جیسا کہ سجاد ظہیر کو محمد سلیم الرحمن صاحب نے پرکھا ہے۔ تاہم اس پرکھ میں ادب کی مخصوص میزان ہی استعمال کی جائے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ادب بھی ہوا میں تخلیق نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنا تمام خام مواد حالات وواقعات اور گردوپیش ہی سے لیتا ہے اور اس کا تاثر کبھی بلاواسطہ طور پر تخلیق میں آجاتا ہے چنانچہ کسی مصنف کو اس کی تخلیق سے غیر حاضر شمار نہیں کیا جا سکتا بلکہ ادب تو شخصیت کا پردہ ہے۔۱۷

ادیب اپنے پڑھنے والوں کا آئیڈیل ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو رہنما تصور کرتے ہیں۔لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا کردار مثبت اور مضبوط ہو تاکہ وہ لوگوں کے لیے مثالی نمونہ بن سکے۔

ڈاکٹر انور سدید اس بات کے خلاف تھے کہ ادیبوں کی بد عنوانیوں اور بدکاریوں پر پردہ ڈالا جائے۔ بلکہ وہ اس بات کے حق میں تھے کہ ان کو سامنے لایا جائے تاکہ معاشرہ اس غلطی سے سبق حاصل کرے اور ادیب اپنی اصلاح کرے۔

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' جب منظر عام پر آئی تو اس کتاب کے خلاف جمیل یوسف نے رد عمل کے طور پر ایک تنقیدی (زہریلا) مضمون اخبار ''پاکستان'' میں بھیجا۔ اس مضمون میں نہ صرف ڈاکٹر انور سدید کی ذات کو ہدف تنقید بنایا گیا بلکہ اس کے ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات کو بھی اچھالا گیا۔ اس کی اشاعت سے قبل اخبار کے ایڈیٹر نے ڈاکٹر انور سدید سے دریافت کروایا کہ اگر وہ چاہے تو اس کی اشاعت روکی جا سکتی ہے۔ لیکن جواب میں ڈاکٹر انور سدید نے کشادہ دلی سے اجازت دی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ درخواست بھی کی کہ اس سے بعد میرا بیان دفاع بھی شائع کیا جائے۔ جب یہ دفاعی بیان شائع ہوا تو حقیقت سب کے سامنے واضح ہو کر آگئی۔ اگر ڈاکٹر انور سدید اپنے تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے جمیل یوسف کے مضمون کو شائع ہونے سے رکوا لیتے تو یہ ادبی اور سماجی اخلاقیات کے خلاف بھی ہوتا دوسرا یہ داغ ہمیشہ انور سدید کے کردار پر رہتا۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ:

> ادیب اپنے معاشرے کا ممتاز فرد اور کئی پڑھنے والوں کا آئیڈیل ہوتا ہے۔ اگر وہ اخلاق کے مروجہ معیار سے گر جائے تو سارا معاشرہ منہدم ہو جاتا ہے۔ ادبی پرچے کا ایک اہم ترین مشن یہ بھی ہے کہ وہ معاشرے کو انہدام سے بچائے اور ادیبوں کی شخصی خامیوں، نقائص، بدعنوانیوں اور بدکاریوں کو منظر عام پر لائے تاکہ معاشرہ اس سے سبق حاصل کر سکے اور ادیب بھی اپنی اصلاح خود کر سکے۔ اب اگر کسی خام کار، منافق و مخروب اخلاق ادیب کو نامزد ہی نہیں کریں گے تو وہ تو اپنا الو سیدھا کرتا رہے گا اور معاشرے مسلسل داغ دار ہوتا چلا جائے گا۔ البتہ جس کو الزام علیہ قرار دیا جائے اسے اپنی وضاحت کا حق ضرور ملنا چاہیے اور یہی معاشرے کا صحت مند عمل ہے۔۱۸

ڈاکٹر انور سدید ادیبوں کو اخلاقی لحاظ سے مکمل دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ادیب بھی انسان ہیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں خامی یا غلطی نہیں ہو گی۔ خامی یا غلطی کا ہونا لازمی امر ہے لیکن اس پر پردہ نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ آگاہ کر دینا چاہیے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔ اگر کسی کو اس کی غلطی سے آگاہ نہ کیا جائے تو وہ اپنی اصلاح بھی نہیں کر پاتا۔

ڈاکٹر انور سدید اس شخص کو بہت اہمیت دیتے تھے جو ان کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کرتا۔ کیونکہ اس شخص کی بدولت وہ اپنی اصلاح کرنے کے قابل ہوتے وہ ایسے انسان کو بہترین دوست گردانتے تھے اور ان کی رائے میں وہ شخص ان کے لیے ان کے دوستوں سے زیادہ مقدم ہو گا۔ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> محترم جناب احمد ندیم قاسمی اردو ادب کی مشہور ترین شخصیت ہیں لیکن وہ خامیوں اور غلطیوں سے مبریٰ نہیں۔ اگر ان کے کسی اقدام سے نئی نسل گمراہ ہوتی تو یہ غلطی ان کے نام سے منسوب ہونی چاہیے اور انہیں اس کی وضاحت کا حق ضرور ملنا چاہیے۔۔۔ بروقت وضاحت نہ کی گئی تو داغ ان پر موجود رہے گا اور تاریخ میں کبھی نہ کبھی ابھر کر ضرور سامنے آجائے گا۔ اس وقت سے ہر ادیب کو ڈرنے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ میری کوئی غلطی یا خامی دیکھیں تو بروقت شائع کریں لیکن مجھے وضاحت کا حق بھی دیجیے۔ آخری بات یہ کہ مجھے میری خامی یا غلطی سے آگاہ کرنے والا میرا دشمن یا بدخواہ نہیں بلکہ میرا دوست ہے اور میں اس کی وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، صبا لودھی، سجاد نقوی اور عامر سہیل سے زیادہ قدر کرتا ہوں۔۱۹

ڈاکٹر انور سدید اپنی زندگی میں ادبی رسائل کے ساتھ منسلک رہے۔ ان رسائل کی ترقی کو ادب کی ترقی شمار کرتے جبکہ ان کی تنزلی ادب کی تنزلی گردانتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید ''ماہ نو'' کے لکھاری اور قاری تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کم وبیش چالیس سال اس رسالے کے ساتھ گزارے۔ ماہ نو ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں نکلنا شروع ہوا۔ پہلے یہ حکومت ہند کی سربراہی میں ''آج کل'' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ بعد میں اس کا نام ''ماہ نو''

کر دیا گیا۔ سید وقار عظیم نے اس کا ادبی مزاج واضح کیا۔ بعد میں رفیق خاور اور حسن عسکری نے اس کا رخ ادبی مسائل کی طرف موڑا۔ پھر قائم نقوی کے دور ادارت میں یہ مشکلات کا شکار ہوا۔ قائم نقوی کے بعد کشور ناہید نے اس کی بھاگ دوڑ اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ انھوں نے ''ماہ نو'' کو اندھیروں سے نکال کر اجالوں میں لانے کی پوری کوشش کی اور آہستہ آہستہ اس کو اس کی کھوئی ہوئی حیثیت پھر سے ملی۔ کشور ناہید کی یہ ساری کوششیں اپنی جگہ لیکن مارشل لا حکومتوں کی اتھل پتھل اس رسالے پر اثر انداز ہوئی اور اس کی تنزلی کا باعث بنی۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں اس رسالے کی تنزلی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مجھے ''ماہ نو'' کی وفات بلکہ مرگِ ناگہانی پر آپ سے اظہار تعزیت بھی کرنا ہے۔ اس رسالے کے ساتھ ہم نے زندگی کے کم وبیش چالیس برس گزارے ہیں، رفیق خاور صاحب نے اس کے دو انتخاب شائع کیے۔ کشور ناہید نے پہلے چالیس سالہ انتخاب چھاپا اور پھر سارک نمبر شائع کر کے دھاک باندھ دی۔ ماہ نو کے آزادی نمبر، جمہوریت نمبر، اقبال نمبر، میر انیس نمبر، میرزا ادیب نمبر بھی اپنی مثال آپ تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ماہ نو ماہنامہ تھا۔ جو اعلیٰ پائے کا ادب کم قیمت پر پیش کرتا تھا۔ اس لیے اس کا حلقہ اثر بھی وسیع تھا۔ اس نے کئی نئے لکھنے والوں کو پروان چڑھایا۔ ۲۰

ڈاکٹر انور سدید اسی مکتوب میں آگے حکومتی رویے پر تنقید کرتے ہیں اور اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ ہماری حکومتیں ادب کی سرپرستی نہیں کرتیں۔ مارشل لاء اور پابندی کے دور میں تو الگ بات کے قلم اور اظہار پر پابندی ہوتی ہے۔ لیکن انور سدید کو اس چیز نے انتہائی مایوس کیا کہ جمہوری حکومتوں کے دور میں بھی ادب کی سرپرستی نہیں کی گئی۔ بجائے اس کے ادبی رسائل کی مالی مدد کی جاتی۔ ان میں بہت سے رسائل جن میں ''ماہ نو'' شامل تھا کو بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ جمہوری حکومتوں پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ماہ نو کے مدیران تبدیل ہوتے رہے۔ ماہ نو سے میرا ناتا قائم رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے اوراق، تخلیق اور اردو زبان کی طرح یہ بھی میری روح میں

جاگزیں ہے۔ خبریں آتی رہیں کہ ماہ نو بند ہو رہا ہے۔یقین اس لیے نہیں آتا تھا کہ ہمارے ہاں جمہوریت کا آفتاب تو اب طلوع ہوا تھا۔ کرنوں کو روشنی پھیلانے کا اذنِ عام ملا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت اظہار کے اس سرچشمے کو بند کر دیتی جس سے ادب ادیب اور قاری کی ذہنی آبیاری ہوتی تھی۔۲۱

ایک دفعہ ادبی رسالے تخلیق میں اظہر جاوید نے مسعود مفتی کے بیان پر کہ ادبی رسالے بہت کماتے ہیں لیکن ادیب کو کچھ نہیں دیتے۔اس بات پر اظہر جاوید نے شدید ناراضگی کا اظہار کیا اوران کی اس بات کو اپنی ذات پر حملہ قرار دیا۔ اس بات پر ڈاکٹر انور سدید نے اظہر جاوید کی اس ذہنی الجھن کو صاف کرنے کی کوشش کی اور ان کو بتایا کہ مسعود مفتی ایک متقی المزاج انسان ہیں۔ وہ کسی صورت آپ کی ذات پر حملہ نہیں کر رہے تھے۔یہ بحث صرف اس لیے چھڑی ہے کہ ادبی رسالے کے مقابلے میں ڈائجسٹ ادیبوں کو کچھ نہ کچھ دے دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی بھی ادیب ڈائجسٹ کو ادبی رسائل پر فوقیت نہیں دیتا۔

ڈاکٹر انور سدید نے ادبی رسائل اور ڈائجسٹ کا تقابل کرتے ہوئے لکھا:

متنازعہ بات یہ ہے کہ ''ادبی رسائل اتنا کماتے ہیں مگر ادیبوں کو کچھ نہیں دیتے۔'' اس ضمن میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ادبی رسائل کاغذ، کتابت، طباعت، جلد بندی اور ڈاک کے سب مصارف ادا کرتے ہیں۔ لیکن وہ شخص جس کے دماغ کا عطر رسالے کی زیب وزینت بنے اسے واقعی کچھ نہیں دیا جاتا۔ان دنوں یہ موضوع اس لیے بھی زیر بحث ہے کہ نقوش، سیپ، نیا دور، تخلیق اور افکار وغیرہ جو افسانہ بلاقیمت وصول کرتے ہیں وہی افسانہ جب جاسوسی یا جنسی ڈائجسٹ میں دوبارہ چھپتا ہے تو مصنف کو دو اڑھائی صد روپے کا اعزازیہ بھی وصول ہو جاتا ہے۔اس کے باوجود کیا بات ہے کہ ادبا اوراق، نقوش، سیپ، نیرنگ خیال، تخلیق اور تحریریں وغیرہ میں تو بغیر اعزازیہ کے چھپنا قبول کرتے ہیں۔ لیکن جاسوسی ڈائجسٹ میں اولین اشاعت کے لیے افسانہ بھیجنا گوارا نہیں کرتے۔میری رائے میں اس

کی وجہ یہ ہے کہ ادبی پرچے ادب کی اشاعت سے ارتفاعِ تہذیب کا مقدس فریضہ مصنف کے کسی تصور کے بغیر انجام دیتے ہیں اور جنسی ڈائجسٹ ادب کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور یوں ادب کی تقدیس کو مجروح کر ڈالتے ہیں۔۲۲

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ادیبوں کو ادب کی خدمت بغیر کسی لالچ کے کرنی چاہیے۔ ان کے پیش نظر مالی منفقت نہ ہو بلکہ ادب کی آبیاری ان کا مقصد ہو۔تب ہی اچھا ادب وجود میں آئے گا۔جب مالی فوائد کو ادب سے وابستہ کر لیا جائے تو یہ ادب نہیں کاروبار کی صورت اختیار کر لے گا۔ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ادیب کو خوددار ہونا چاہیے۔اس کو اپنے ذاتی فائدے کے لیے ادب کو پامال نہیں کرنا چاہیے۔اس کو اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر ادب کی خدمت بجالانی چاہیے۔

مرزا ابن حنیف جو کہ ملتان سے تعلق رکھتے تھے۔ڈاکٹر انور سدید انگارے کے اپنے ایک مکتوب میں ان کی خود داری کے بارے میں لکھتے ہیں:

وہ ایسے شخص تھے جنھوں نے اپنی خلوت میں ذاتی انجمن آراستہ کر رکھی تھی اور وہ حقیقت کی دریافت اور صداقت کی بازیافت میں ہمیشہ سرگرم عمل رہتے تھے۔ان جیسا غنی مزاج، استغنا پسند اور زردنیا سے نفرت کرنے والا ادیب کہا نظر آئے گا جبکہ آج کے بڑے بڑے ادیب بھی اشرفیوں کا ڈھیر دیکھنے کی آرزو کرتے ہیں اور اظہار تمنا کے لیے آمروں کے دربار میں غالب کا شعر یاد کر کے چلے جاتے ہیں۔۲۳

ڈاکٹر انور سدید ایسے اعزازت کے بھی خلاف تھے جو کہ عوامی حکومتوں کی طرف سے نہ ہو۔اس جب صدر ایوب کی حکومت میں مختلف ادبی ایوارڈ دیئے گئے تو ان پر بھی تنقید کی گئی۔ ایسا ہی ایک ایوارڈ حسن کارکردگی کی صورت احمد ندیم قاسمی صاحب کے حصے میں بھی آیا۔

غلام حسین اطہر نے احمد ندیم قاسمی سے دوران انٹرویو اس ایوارڈ کی واپسی کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے اس ایوارڈ کی واپسی کو ایک عجیب سی شرط کے ساتھ مشروط کر دیا کہ وہ ایوارڈ اس صورت واپس کریں گے جب شہروں کو دیئے گئے ایوارڈ واپس کیے جائیں۔

احمد ندیم قاسمی کے اس رویے پر ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مکتوب میں لکھا:

> یہاں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ڈکٹیٹر ایوب کے عطا کردہ حسن کارکردگی کے انعام کو قاسمی صاحب نے لاہور، سرگودھا اور سیالکوٹ کے ہلال استقلال کے مترادف قرار دیا ہے اور اصرار کیا ہے کہ یہ شہر ہلال استقلال واپس کریں گے تو وہ بھی اپنا اعزاز واپس کر دیں گے۔ ہلال استقلال جرات، شجاعت اور پامردی کا اعزاز ہے اس لیے اس کا موازنہ حسن کارکردگی کے انعام سے کرنا مناسب نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ صدر ایوب کے زمانے کی تعبیر اب جس تناظر میں سامنے آرہی ہے۔اس سے بہت سے سابقہ نتائج کی کایا پلٹ گئی ہے۔ لیکن ان شہروں کے قومی اعزاز میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسری طرف اس نئی تعبیر کی روشنی میں ڈکٹیٹر ایوب کے ثنا خوانوں نے اپنے رویے کی وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور بیشتر غیرت مند ادبا اپنے سابقہ رویے پر نادم ہونے کے بجائے بعد کے حکمرانوں کی ستائش بھی اسی طریقے سے کرتے رہے ہیں۔۲۴

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں جابجا ترقی پسند تحریک کا ذکر بھی ملتا ہے جس میں ترقی پسند تحریک اور اس سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف حیثیتوں سے سامنے آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۵ء میں لندن سے ہوا۔ اس تحریک کے بانیوں میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور سجاد ظہیر تھے۔ اس انجمن کے نزدیک ادب کو زندگی کے لیے مفید ہونا چاہیے۔ جبر اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے جس میں جدت ہو، سچائی، عقلیت اور انسانیت کا ترجمان ہو۔

ابتدا سے اس تحریک میں اشتراکیت کی گونج سنائی دینے لگی۔ ادب، ادب کے بجائے سیاست کا روپ اختیار کر گیا۔ ادب میں پروپیگنڈہ زور پکڑ تا گیا۔ جس سے ادب کی اصل حیثیت مجروح ہوتی چلی گئی۔

ڈاکٹر انور سدید نے ایک عام ادیب اور ایک ترقی پسند ادیب کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا:

جیسے ادب کا خالص فن کار نظم، غزل اور افسانے کی تخلیق سے پہلے اپنا کیتھارس کرتا ہے اور پھر اس میں قاری کو بھی شریک کر لیتا ہے اور ترقی پسند فن کار ادب کو اولین سطح پر پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرتا ہے اور پھر اس کی قیمت پارٹی کی حکمران مشینری سے اس کی قیمت عہدہ، منصب یا ایوارڈ کی صورت میں وصول کر لیتا ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہو گا وہ ادیب جس نے فرد کو کتھارس کے عمل سے گزرنے کا موقع دیا حیات دوام پا لیتا ہے اور ترقی پسند ادیب وقت کے تناظر میں ہی گم ہو جاتا ہے۔۲۵

ترقی پسند تحریک میں ابتدائی ایام سے ہی ادیبوں کو آزاد کر دیا گیا تھا۔ مذہب کے معاملے میں ان پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔ چاہے وہ عیسائی ہوں، مسلمان ہوں، یہودی ہوں یا بدھ مت سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ البتہ ان میں ایک نظریہ مشترک ہونا چاہیے جو کہ آزادی وطن کا نظریہ تھا۔ وہ ادب میں اپنے فلسفے اور نظریے کی تبلیغ کرنے کے بھی مجاز تھے لیکن ان کا یہ نظریہ ادب برائے زندگی کے مخالف نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ ترقی پسند ادیب اسلاف کی عزت کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کا خیال تھا ترقی کرنے کے لیے ماضی کو چھوڑنا لازمی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ترقی پسندوں کے اس گروہ کے خلاف تھے جن کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا تھا۔ جو مادی فائدے کے پیچھے اپنا ایمان تک بیچ دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

میرا روئے سخن ہمیشہ ان ترقی پسند ادیبوں کی طرف ہوتا ہے جنھوں نے عظمت انسان کا علم بلند کیا۔ لیکن اپنے قول و فعل سے ذلت انسانی کی مثال پیش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ترقی پسند ادیبوں نے عظمت کا چراغ اپنے خون جگر سے جلایا۔ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ بیشتر لوگوں نے تو بہتی گنگا سے اپنے کھیتوں کو پانی دینے کی منصوبہ بندی کی اور حالات کے مطابق اب بھی کر رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر کی حکومت آنے سے پہلے ان کے ایک مخالف ادیب نے تو ان کی تعریف میں کالم لکھنے شروع کر

دیئے تھے۔اب دال نہیں گلی تو پھر مخالفت کر رہے ہیں۔ایک اور صاحب صدیق سالک سے مفادات حاصل کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے لیکن جب وہ ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے تو اس حق پرست ادیب نے سب سے پہلے صدیق سالک کے خلاف زہر افشانی کی۔۲۷

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ترقی پسند ادیبوں میں زیادہ تر وہ ادیب ہیں جو غیر ترقی پسندوں کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ان کے ادب پاروں میں نظریاتی شور کی گونج سنائی دیتی ہے۔اس کے باوجود کچھ ادیب ایسے بھی ہیں جو اچھا ادب تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ایسے ہی ادیبوں کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

مضامین کے حصے میں رفعت سروش نے نکہت بریلوی کی کتاب حرف زیر لب کا عمدہ تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔میں اس کتاب کا مطالعہ کر چکا ہوں۔نکہت بریلوی ترقی پسند شاعر ہیں اور سوویت یونین کے انہدام پر ملامت کا اظہار کرتے ہیں۔لیکن ان کی شاعری میں پیپاکھڑکانے اور نظریاتی شور مچانے کی کیفیت نظر نہیں آتی بلکہ زیر لب اور خود کلامی نمایاں ہے۔۲۷

ادب اور ادیب معاشرے اور اس میں ہونے والے واقعات کا حصہ ہوتے ہیں اور ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔یہ واقعات چاہے منفی حیثیت کے ہوں یا معاشرتی، سیاسی ہوں یا سماجی ادب اورادیب کا ان سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔

پاکستان کی سیاسی صورت حال کا اگر جائزہ لیا جائے تو بہت سے مدوجزر ہمارے سامنے آتے ہیں۔قیام پاکستان کے چند سالوں میں پاکستان کی سیاست امریت کا شکار ہو گئی اور مارشل لا لگ گیا۔ سیاسی صورتحال میں ادیب کے قلم بھی یاپند سلاسل ہو گئے۔ان سے آزادی رائے چھین لیا گیا۔ اشاروں، کنایوں سے بات ہونے لگی۔مزاحمتی شاعری اس دور کی پیداور تھی۔لیکن ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں مایوسی، شاعری اور شاعروں کے مزاج میں ررچ بس چکی تھی۔مارشل لا کااثراتنادیرپا تھا کہ اس کے ختم ہونے کے بعد بھی ادیب اس کے زیر اثر دکھائی دیتے ہیں۔

اپنے ایک مکتوب میں ڈاکٹر انور سدید مارشل لاء کے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

تخلیق کی ایک سابقہ اشاعت میں آپ نے اشارۃً ایسے شاعروں کا ذکر کیا تھا جو گزشتہ چند برسوں میں کی جانے والی اپنی شاعری سے چن کر ایسے اشعار تلاش کر رہے ہیں جن سے مزاحمت کا لغوی مفہوم آشکار کیا جا سکے۔ اس ضمن میں میں نے آخری مارشل لاء سے (جسے ستار طاہر نے بدترین مارشل لاء قرار دیا ہے) کچھ عرصہ پہلے کی شاعری پرکھنے کی کوشش کی تو حیران ہوا کہ اس دور میں بھی شعرا پر شدید قسم کی گھٹن طاری تھی اور وہ عوامی جمہوریت کے دور میں بھی لکھ رہے تھے۔

موت کی انجمن آرائی ہے

اور خدا ہے کہ تماشائی ہے (جون ۱۹۷۲ء)

محکوم ہو کچھ ایسا کہ آزاد سا لگے

انسان کو دورِ نو میں یہ منصب نیا ملا (اگست ۱۹۷۳ء)

میں بولتا نہیں ہوں، مگر دیکھا تو ہوں

لب میرے سِل چکے ہیں مگر آنکھیں ہیں واسدا (اکتوبر ۱۹۷۴)۲۸

انور سدید کے خیال میں مارشل لا سے ادیبوں کے اندر ایسی قنوطیت نے جنم لیا تھا جو کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، امید دم توڑ چکی تھی۔ جمہوریت کا آفتاب اگرچہ طلوع ہوا مگر اس کی روشنی اندر کی تاریکی کو مات دینے میں ناکام رہی۔ جمہوری دور حکومت میں بھی وہ ہی مایوسی، نا امیدی اور قنوطی رویے سامنے آرہے تھے۔ شاعروں کے قلم تو جیسے لفظ امید سے ناآشنا ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

اور آج جب کہ دستوری جمہوریت کا آفتاب عالم تاب ہمارے ملک عزیز پر طلوع ہو چکا ہے۔ جبر کا دور ختم ہو چکا ہے اظہار کو آزادی مل گئی ہے اور گھٹن ناپید ہے۔ تب بھی شاعری میں اس قسم کی سطریں ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔

زندگی کے جتنے دروازے ہیں، مجھ پر بند ہیں

دیکھنا حد نظر سے آگے بڑھ کر دیکھنا بھی جرم ہے

سوچنا اپنے یقینوں سے نکل کر سوچنا بھی جرم ہے

''کیوں'' بھی کہنا جرم ہے، کیسے بھی کہنا جرم ہے (اگست ۱۹۸۹ء)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شعر اب بھی مزاحمت کے عمل کو رویہ کار لا رہے ہیں؟

یا قنوطیت نے ان پر اتنا غلبہ حاصل کر لیا ہے کہ ان کی شاعری سے مایوسی اور شکستگی اور بے بسی کے سوا کچھ ظاہر نہیں ہوتا؟۲۹

تمام صورت حال کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں ادیبوں کے منفقانہ رویوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو کہ وقت کے ساتھ اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خواہشات کے پجاری ہیں اور جس رخ کی ہوا ہو اس رخ پر چلنے کے قائل ہیں۔ مارشل لاء کے دور میں بھی بہت سے ایسے ادیب سامنے آئے جنھوں نے اپنے قول اور فعل کے ساتھ مارشل لاء کی حمایت کی اور مالی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اپنی جیب کو نوٹوں سے بھرنے میں لگے رہے لیکن جوں ہی حالات تبدیل ہوئے ان لوگوں نے بھی اپنے موقف تبدیل کرنا شروع کر دیئے اور نئے آنے والوں سے امیدیں وابستہ کر لیں۔ ''رائٹر گلڈ'' سے تعلق رکھنے والے ادیب اس حمایت میں شامل تھے۔ڈاکٹر انور سدید رائٹر گلڈ کے ادیبوں کے طرز عمل کے بارے میں لکھتے ہیں:

سب سے پہلے تو مجھے احمد بشیر صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انھوں نے ایک اہم موضوع پر اپنی شہادت رقم کی۔ لیکن ان کے نتیجے کا استخراج میرے اخذ کردہ نتیجے سے مختلف نہیں، بلکہ وہ تو ایک قدم اور آگے گئے ہیں اور لکھا ہے کہ ''گلڈ کہ سرکردہ ادیب پریشان ہیں کہ انھوں نے کسی بھی آسن سے مارشل لاء کی حمایت نہیں کی؟ نہ صرف حمایت کی بلکہ ایوب خان نے جب کتاب لکھی (یا لکھوائی) اس رزق سے موت اچھی۔ تو گلڈ نے اسے ادیب ہونے کا پروانہ عطا کیا اور اسے اپنی رکنیت بھی عطا کی۔۳۰

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں رائٹر گلڈ میں بہت سے ایسے ادیب شامل تھے جنھوں نے ایوب خان کا ساتھ دیا۔ اس کو ادیب مانا اور اس کی کتاب ''اس رزق سے موت'' اچھی پر اس کو رائٹر گلڈ رکنیت بھی دی گئی۔

اپنے ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

> اس خط کی تحریک الطاف گوہر صاحب کی کتاب ''تحریریں چند'' پر آپ کے تبصرے نے پیدا کی ہے۔ آپ کو ووہ حقیقت حیرت ناک المناک اور خوفناک محسوس ہوئی جو اس کتاب میں الطاف گوہر صاحب نے منکشف کی ہے یعنی کہ ایوب خان کے مارشل لاء کے وقت جب رائٹرز گلڈ وجود میں آئی تو اس کے پہلے جلسے میں ادیبوں نے اعلان کیا کہ وہ مارشل لاء کے زیر سایہ جو اطمینان محسوس کر رہے ہیں وہ انہیں اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔ لیکن یہ بات مجھے خلاف واقعہ محسوس نہیں ہوتی۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے ادبا نے نظریاتی ثابت قدمی کا ثبوت بہت کم دیا ہے اور مفادات کی فصل کاٹنے کا موقع آیا تو ضمیر کو مجروح کرنے اور اس کی آواز کو دبانے میں تاخیر سے کام نہیں لیا۔۳۱

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے مکاتیب میں ایسے بہت سے ادیبوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہ ایوب کے دور میں اس کے مداح وفادار تھے۔ لیکن حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی ان کی وفاداری بھی بدل گئی۔ ضیا کے گن گانے والے اس کی موت کے اور اس کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر انور سدید ایک پر امن شخص تھے اور جنگ وجدل کے مکمل طور پر خلاف تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جب انڈیا کی حکومت نے گیارہ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکہ کیا تو ڈاکٹر انور سدید نے اس پر اپنے گہرے تحفظات کا اظہار کیا کہ ان کے خیال میں اس طرح کمزور وعوام پر ہر وقت موت کے سایہ لہراتے رہیں گے اور دونوں قوموں میں فاصلے بڑھتے چلے جائیں گے۔

ان کے خیال میں دنیا میں امن کے لیے ضروری ہے کہ دنیا ان ایٹمی ہتھیاروں سے دور رہے تاکہ تمام ممالک کی عوام محبت کی زندگی بسر کر سکیں اور کسی کا خوف ان کے دلوں میں نہ ہو۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> گیارہ مئی ۱۹۹۸ء کو جب بی جے پی حکومت کے وزیر اعظم واجپائی نے اعلان کیا کہ بھارت ایٹمی طاقت بن گیا ہے اور پھر اس نے کشمیر میں جدوجہد آزادی کو کچلنے کا عمل تیز تر کر دیا اور پاکستان کو آزاد کشمیر سے دستبردار ہو جانے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں تو میں نے کئی دن شدید اضطراب میں گزارے۔ خطرہ یہ تھا کہ بھارت کی جنونی حکومت اگر ایٹم بم بنا سکتی ہے تو اسے چلا بھی سکتی ہے اور اس کا رخ بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ بم چین اور پاکستان جیسے دشمن ملکوں کو زیر کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ میں کئی دنوں تک انتظار کرتا رہا کہ بھارت کا دانشور طبقہ اس پر اپنا احتجاج کرائے گا (درج) لیکن جب کہیں سے دور کی آواز بھی نہ آئی تو بے چینی اور پریشانی اور اضطراب بڑھ گیا کہ اب ہمارا حشر بھی ناگاساکی اور ہیرو شیما کہ باشندوں جیسا ہونے والا تھا جن کی اجتماعی تباہی کی برسی پچھلے دنوں منائی گئی۔ ۳۲

انور سدید نہ صرف بھارت کے ایٹمی دھماکہ کرنے پر نالاں تھے بلکہ جب بھارت کے جواب میں حکومت پاکستان نے چاغی کے پہاڑوں میں ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کو ایٹمی دھماکے کیے تو اس پر بھی ڈاکٹر سدید نے تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس کو دفاعی حکمت عملی کے بجائے تباہ کن عمل قرار دیا۔ دوسری طرف پاکستان میں اس پر خوشی کا اظہار ہوا ہر طرف شادیانے بجائے گئے اور ان کو یوم تکبیر کا نام دیا گیا۔

ڈاکٹر انور سدید کا خیال تھا کہ بظاہر تو یہ دفاعی حکمت عملی پاکستان اور بھارت کے حق میں نظر آتی ہے لیکن اس کے نتائج بہت بھیانک ثابت ہوں گے۔ غریب عوام جو کہ پہلے ہی مشکلات کا شکار ہے مزید مشکلات کے چنگل میں پھنستے چلے جائیں گے۔ ان کے خیال میں باشعور طبقے کو اس پر آواز اٹھانی چاہیے تھی۔ لیکن کہیں سے کوئی احتجاج بلند نہیں ہوا۔ اور نہ ہی نام نہاد انسانیت کے محافظ ترقی پسندوں نے آواز اٹھائی۔ اپنے ایک مکتوب میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> پھر ۲۸ مئی آ گئی پاکستان نے بھی اپنی ایٹمی اہلیت کا برملا اعلان کر دیا۔اس پر پورے ملک میں شادیانے بجائے جانے لگے کہ بھارتی خطرے کا توڑ تلاش کر لیا گیا تھا۔لیکن جن خطرات سے اب بھارت اور خود پاکستان کے عوام دوچار ہو گئے تھے ان پر کسی نے آواز نہ اٹھائی۔ہمارے ترقی پسند انسان دوست ادبا بھی مہربلب رہے اور اب تک ان کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔نہ بھارت کی دراز دستی پر احتجاج ہوا۔نہ پاکستان کی دفاعی لیکن تباہ کن حکمت عملی تک ہر کسی نے رائے دی۔لہٰذا دریافت کرنا مناسب ہے کہ علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی جیسے انسانیت کے محافظ کہاں ہیں؟۳۳

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں بجائے اس کے بھارت اور پاکستان کی حکومت اپنے ملکوں کی غریب عوام کا حال بہتر کرنے کی کوشش کرتے ملک کا پیسہ ان کی خستہ حالت کو بہتر کرنے کے لیے لگایا جاتا۔ان کو روز گار فراہم کیا جاتا لیکن اس کے برعکس ملکی معیشت کا زیادہ حصہ دفاعی پالیسی میں صرف کر دیا جاتا ہے اور عوام کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جا رہی عوام جب تک خستہ حال ہیں حکومت کی خوشحالی ناممکن ہے۔حکومت تنخواہوں اور پنشنوں میں اضافہ نہیں کرتی اور ان لوگوں کا خیال نہیں کر رہی جنھوں نے اپنی پوری زندگی اور جوانی کا خون اس ملک کی خدمت میں لگا دیا۔

ڈاکٹر انور سدید حکومت کے اس رویے پر شدید نالاں ہیں اور طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں:

> واجپائی صاحب نے عوام الناس کے حقوق کی پاسداری نہیں کی اور اب نواز شریف صاحب خود انحصاری کا نعرہ لگا رہے ہیں تو یہ بھی عوام کو جو پہلے ہی جاں بلب ہیں مزید کچلنے اور اپنی سریر آرائی قائم رکھنے کا حربہ ہے۔میری آواز نحیف ہے؟ لیکن میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے طرز عمل اور آمرانہ رویے پر احتجاج کرتا ہوں۔یہ احتجاج کسی سیاست دان کا نہیں بلکہ سیاست کے ظلم سہنے والے قلم کے مزدور کا احتجاج ہے جس کی پنشن اس کی کفیل نہیں۔لیکن وہ رزق حلال پیدا کرنے کے لیے مشقت میں مصروف ہے۔حکومت بے خبر ہے کہ اس قسم کے بوڑھوں کی جوانی کا سارا خون

اس نے ملازمت کے دوران نچوڑ لیا تھا اور اب وزیر خزانہ سرتاج عزیز صاحب کہتے ہیں کہ پنشنوں میں اضافے کے لیے خزانے میں پیسے نہیں ہیں؟ کیا آپ انہیں یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ ان کی حکومت نے جو ایٹم بم بنایا ہے وہ سب سے پہلے پاکستان کے شہروں پر چلا دیں۔ انہیں قلیل آبادی کے لیے اب کیا نعرہ لگانے کی ضرورت ہے۔

بوڑھے معدوم کیجیے، ملک خوشحال کیجیے۔۳۴

پاکستان کے قیام کو ۶۸ برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے اس تمام عرصے میں پاکستان کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جن میں قدرتی آفات سیلاب، زلزلہ اور دیگر بہت سے عذاب ایک طرف اور نااہل اور کرپٹ حکمرانوں کی صورت میں عذاب الٰہی ایک طرف۔ کیونکہ جیسی کوئی قوم ہو گی خدا اس پر ویسے ہی حکمران مسلط کرے گا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء مسلمانانِ پاک وہند کے لیے بہت تابناک دن تھا۔ اس دن کے حصول کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے لاکھوں قربانیاں پیش کی تھیں اور انہی قربانیوں کے صلے میں یہ ملک خدا کی طرف سے تحفے میں عطا ہوا۔ مسلمانوں نے جتنی قربانیاں دیں اس سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں کہ آزاد ملک میں نہ صرف انہیں آزادی کی شمع روشن ملے گی بلکہ وہ ہر شعبہ ہائے زندگی میں شریعت خداوندی کو رائج کرتے ہوئے بہت سے ثمرات پائیں گے۔ ہر طرف انصاف کا دور دورہ ہو گا۔ بیٹوں اور بہنوں کے سہاگ سلامت رہیں گے، چھوٹے اور بڑے کی تفریق مٹ جائے گی۔

مساوات اور اخوت کی اجارہ داری ہو گی کہ مگر افسوس صد افسوس ان تمام امیدوں کا خون ہو گیا۔ ملک پاکستان کی کشتی کو جو ملاح قائد اعظم کے بعد دوسرے میسر آئے انھوں نے پاکستانیوں کے سارے خواب چکنا چور کر ڈالے۔ انہیں میں حکمرانوں کی لالچ اور خود غرضی کے باعث پاکستان دن بدن مشکلات کا شکار ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید کو بھی حکمرانوں کے اس رویے پر شدید دکھ تھا۔ اپنے ایک مکتوب میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

یہ عریضہ ۱۴ اگست ۲۰۱۰ء کو لکھ رہا ہوں جو ہمارا ۶۴ یوم آزادی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ آج ہم کس عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایک آفت موسلادھار بارشوں کی صورت میں آسمان سے نازل ہو رہی ہے۔ دوسری سلسلہ در سلسلہ سیلاب کی صورت املاک تباہ کر رہی ہے، انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی ہے۔

بیشتر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارے حکمرانوں کی بداعمالیوں کی سزا پوری قوم کو دی جا رہی ہے۔ ایک تجزیہ نگار نے حکمران اشرافیہ کو کھلے بندوں بدمعاشہ لکھا ہے۔ کیونکہ ان کے ایجنڈے سے عوام الناس کو جن کے ووٹوں سے انہیں حکمرانی ملی ہے... یکسر خارج ہیں... مولانا حامد علی خان کی نظم میں وہ کرب موجود ہے جو قومی ادبا نے ۱۹۲۴ء میں پیدا کر رکھا تھا۔ لیکن اس میں رجائیت کا زاویہ بھی نمایاں ہے۔ چنانچہ انھوں نے ''قبائے خلافت'' کو چاک چاک اور کائنات کو خونِ مسلمان سے لالہ رنگ دیکھا تو دعا کی:

یا رب نہ پھر نصیب ہمیں یہ نظارہ ہو

اور مصیبت کی اس گھڑی سے یہ نتیجہ بھی نکالا:

یہ آمدِ بہار کا شاید اشارہ ہو۔۳۵

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں کو خون میں نہلایا گیا۔ ان کی عزت و آبرو کو داغ دار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ تعلیم سے دور کرنے کے حربے آزمائے گئے۔ مسلمانوں کی زبان کے خلاف سازشیں کی گئیں۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ ترکی جس کے خلیفہ کو مسلمان اپنا خلیفہ تسلیم کرتے تھے اور جو پوری دنیا کے مسلمانوں کی خلافت کا مرکز نگاہ تھا اس کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں امید باقی تھی کہ ان کا یہ زوال عنقریب ختم ہو جائے گا اور طلوعِ سحر ہو گی۔

اگرچہ مسلمانوں کی امیدوں کے مطابق آزادی مل گئی۔ وہ ایک آزاد وطن کے مالک بن گئے لیکن اس کے حکمرانوں نے اس ملک کی نظریاتی اساس کے برعکس اپنے مفادات کو عزیز جانا۔ ملکی ترقی کے بجائے شخصی ترقی پر زور دیا۔ ملک کا خزانہ لوٹ کر اپنی تجوریاں بھر لیں اور ملک اور اس کے غریب عوام دن بہ دن مشکلات کا شکار ہونے لگے۔

ڈاکٹر انور سدید اس صورتحال پر نوحہ کناں ہیں اور لکھتے ہیں:

۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام ہندی مسلمانوں کے لیے آمدِ بہار کی نوید ہی تھا۔ لیکن سیاستدانوں، سول اور فوجی بیوروکریٹوں اور نودولت صنعت کاروں اور جاگیرداروں نے اس بہار میں اگنے والے شگوفوں کے نرم ونازک پتے نوچ ڈالے۔ قدرت نے ۶۳ برس تک ہمارا امتحان لیا۔ حکمرانوں نے قائد اعظم کے پاکستان کا حلیہ بگاڑ دیا اور اب ہم سب عذابِ الٰہی کی زد میں ہیں۔ ملک طوفان نوح کی لپیٹ میں ہے۔ چیرہ ودست حکمران حکومت کر رہے ہیں لیکن قدرت تعزیز سے غافل ہیں کہ ان کے ذاتی ایجنڈے میں کسی قسم کی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آتے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں:

وہ کر چکے "قبائے سیاست" کو چاک چاک

دامانِ دولت اب ان کا بھی پارہ پارہ ہو۔۳۶

پاکستان کی روز بروز ہوتی ابتر حالت ڈاکٹر انور سدید کے لیے بہت دکھ کا باعث تھی۔ ان کے خیال میں اس حالت کے ذمہ دار اس ملک کے حکمران تھے جو کہ صرف اپنی خواہشات کے حصول میں ملک کو بھول بیٹھے تھے اور اس سب کا نتیجہ ملک میں اقتصادی اور معاشی بدحالی کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔

ان تمام حالات میں جہاں ملک بہت سے مسائل کا شکار تھا وہاں بجلی کا بحران بھی ایک سنگین مسئلہ تھا اور اس مسئلے کی زد میں آکر تقریباً تمام کاروبار زندگی سست پڑ چکے تھے۔ چاہے وہ کارخانوں کی کارکردگی ہو یا تعلیمی اداروں میں مشکلات۔ سب اسی بحران کے تحفے تھے۔ الحمرا (ادبی مجلہ) کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کا تعلق بہت دیرینہ تھا اور اس کا انتظار بڑی شدت سے کیا کرتے تھے۔ لیکن بجلی کی طویل لوڈ شیڈنگ کے اثر سے الحمرا بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر انور سدید اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے پورے ملک کو عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کے اثرات الحمرا پر بھی نازل ہوئے اور اس مرتبہ پرچہ قدرے تاخیر سے ملا۔ گویا الحمرا کے قارئین کو لوڈشیڈنگ کے عذاب کے ساتھ ساتھ الحمراء کے

انتظار کا بھی عذاب سہنا پڑا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اٹھارہویں صدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بدقسمتی سے بحرانوں کا سلسلہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ خدایا پاکستان کو اس کے نظریاتی وجود کے ساتھ سلامت رکھے۔

۳۷

علم کا حصول پر مرد وزن پر فرض قرار دیا گیا ہے کیونکہ معاشرے کی ترقی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے وہ قومیں جو دنیا میں تعلیم کو اہمیت نہیں دیتی وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔ لہٰذا اپنا اور اپنی آنے والی نسلوں کا مستقل تابناک بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں تعلیم کو فروغ دیا جائے اور پسماندہ علاقوں کی عوام تک بھی تعلیم کی رسائی ممکن بنائی جائے۔ لیکن ایک بات جس کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جو ان میں اچھائی برائی کا شعور اجاگر کرے ان کو رشتوں کی تمیز کروائے۔ مساوات کا درس دے ان کی فکر کو جلا بخشے۔ جب بچہ ڈگری لے کر نکلنے، اس کا مقصد صرف نوکری کا حصول نہ ہو بلکہ وہ ایک ایسے شہری کے طور پر سامنے آئے جس کو اس ملک کے قانون کا پاس ہو۔ اپنے حقوق کے ساتھ اپنے فرائض سے بھی آگاہ ہو۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں تعلیم کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ بات درست ہے کہ ایک دور میں تعلیم، فکر وفن اور سماجی علوم کو فوقیت حاصل تھی۔ ان کا حصول کامل فکر وخیال کو منور کر دیتا تھا اور ذہنی بالیدگی کا سبب بھی بن جاتا تھا۔ مجھے اپنے بچپن میں ایسے متعدد بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کی تعلیم مسجد کے مدرسے تک محدود تھی لیکن ان کا ذوق وشوق اس مقام تک پہنچ گیا تھا کہ حافظ، رومی اور اقبال پر بحث کرتے۔ ان بزرگوں نے اپنے بچوں کو "دو پیسے" کی مزدوری پر نہیں لگایا، علم کی دولت سے سرفراز کیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تعلیم عام ہو تو انسان کی ذہنی ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں اور وہ اپنی ترجیحات بھی خود مقرر کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔۳۸

مغرب کے اثرات سے ہمارا نظامِ تعلیم بھی متاثر ہوا فکر وفلسفے کی جگہ سائنس وٹیکنالوجی نے لے لی۔ اگرچہ اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں لیکن اس سے ہمارے اخلاقیات کو سنوارا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سائنس کی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا حصول بھی ممکن بنایا جائے۔ تاکہ ہمارے معاشرے میں اچھی روایات فروغ پا سکیں۔ مغربی ترقی جس نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ نزدیک جانے پر اس کے بہت برے اثرات بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ان کا ازالہ صرف اور صرف سماجی علوم کے حصول میں ممکن ہے۔ ڈاکٹر انور سدید مزید لکھتے ہیں:

> سائنس اور ٹیکنالوجی اور کمپیوٹر لٹریسی وغیرہ اس دور کی ایجادات ہیں۔ جن سے اغماض ممکن نہیں۔ تاہم ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بغیر ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینے کی سعی ہو رہی ہے اور اب جو المیہ ظاہر ہو رہا ہے اس کا اظہار آپ نے اداریے میں دوٹوک الفاظ میں کر دیا ہے:
>
> وہ مغربی اثرات جنہیں رفتہ رفتہ اس معاشرے کے ساتھ ہم آہنگی کرنی تھی اب ایک بے ربط اور اندھی صورتحال کے ساتھ ہماری ذہنی اور ثقافتی اکائی توڑنے لگے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ بھی سامنے آرہا ہے کہ عام طلبا کی توجہ سماجی علوم سے بالکل ہٹ گئی ہے۔۳۹

آج اگر ہم اپنے معاشرے میں ناہمواریاں دیکھتے ہیں تو حیران ہوتے ہیں کہ ہم اس تباہی کی طرف کیوں کر جا رہے ہیں۔ تو اس کا آسان سا جواب یہ نظر آتا ہے کہ اخلاقیات سے دوری اور سماجی علوم سے انحراف کا اس کی اصل وجہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا مطالعہ کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا علم بہت وسیع ہے۔ ادب کے ہر شعبے میں ان کی معلومات وسیع ہیں۔ زبان اور اس کے نظریات بھی ان کے مکتوبات میں ملتے ہیں اور اس سے ڈاکٹر انور سدید کا لسانی نظریہ ہمارے سامنے واضح ہو کر آتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیالات میں زبان کے جو دو نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں ایک نظریہ سرسید احمد خان کا تھا اور دوسرا مولانا محمد حسین آزاد کا تھا۔

سرسید احمد خان کے ہاں زبان مقصدیت کے بوجھ سے لدی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس میں سادگی ملتی ہے اور زبان کا مقصد قاری تک نظریات کی ترسیل ہے۔دوسری طرف محمد حسین آزاد کا نظریہ ہے اس میں سادگی کے بجائے پرکاری ملتی ہے۔آزاد کی زبان قاری کے جذبات کو متاثر کرتی ہے اور اس کی دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں زبان کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ہمارے ہاں اب تک زبان کے جو دو نظریے مقبول ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک سرسید احمد خان نے اور دوسرے کو مولانا محمد حسین آزاد نے رائج کرنے کی کوشش کی۔چنانچہ دیکھئے کہ سرسید کی زبان پر مقصدیت کا پورا بوجھ لدا ہوتا ہے اور وہ پوری خوبی سے یہ بوجھ قاری کو منتقل کر دیتے ہیں۔یہ زبان سماجی اور معاشرتی طور پر قاری کو مقام امتیاز تک لپکنے اور ثمریات ہونے کی دعوت دیتی۔لیکن قاری کے داخل کی دھڑکن کو تیز نہیں کرتی۔دوسری طرف الفاظ کا وہی ذخیرہ جب محمد حسین آزاد کے لمس سے آشنا ہوتا ہے تو جگنوؤں کی طرح لو دینے لگتا ہے اور قاری کے دل کا آہنگ تیز ہو جاتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ بیسویں صدی میں سرسید کے اسلوب کا ردعمل علی گڑھ میں پیدا ہوا۔اور وہاں جس اسلوب کو کامیابی اور ترویج عام حاصل ہوئی ہے۔وہ محمد حسین آزاد کا تخلیقی اسلوب تھا۔چنانچہ آج علی گڑھ کی نثر کو جو امتیاز حاصل ہے وہ سرسید کی بدولت نہیں بلکہ رشید احمد صدیقی، سجاد حیدر یلدرم، آل احمد سرور، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ذکا الدین شایان، ابن فرید اور خلیل الرحمان اعظمی کی نثر کی وجہ سے ہے۔۴۰

ڈاکٹر انور سدید کی رائے روشنی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید کے اسلوب کا ردعمل خود علی گڑھ میں سامنے آتا ہے اور علی گڑھ میں سرسید کے بجائے محمد حسین آزاد کا اسلوب زیادہ فروغ پاتا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس جگہ سرسید کا اسلوب دم توڑ گیا بلکہ آگے جا کر یہ اسلوب ترقی پسند تحریک کے ادبا کی تحریروں میں اجاگر ہوتا ہے جو کہ ادب میں آسانی کے قائل ہیں۔اس اسلوب کی مدد سے ترقی پسند ادبا نے اپنے نظریے کو فروغ

دیا۔ شمالی ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے اسلوب نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ پنجاب میں یہ اسلوب زیادہ دیر تک نہ چل سکا کیونکہ پنجابی رنگا رنگی کے قائل تھے۔

لہٰذا پنجاب میں محمد حسین آزاد کا اسلوب مخزن کی تحریک میں ملتا ہے۔ اس اسلوب کو علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، ظفر علی خان، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، ن م راشد، میرا جی، مجید امجد اور دیگر بہت سے لوگوں سے ہوتا ہو۔ وزیر آغا کے ہاں ملتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سرسید کا اسلوبِ نثر مردہ ہو گیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اسلوب نثر کو ترقی پسند ادبا نے اپنا کر نظریاتی تبلیغ کا وسیلہ بنایا۔ ترقی پسند ادبا کے پیش نظر واقعہ کی ترسیل اور اس کا صحافتی مستقیم انداز ہوتا ہے۔ اس لیے وہ لفظ کو تخلیقی کٹھالی سے گزارنے کی بجائے اس کے لغوی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یوں فرد کو منطقی انداز سے اپنا نظریاتی اسیر بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ سرسید کے اس اسلوب کو ترقی پسند تحریک نے عمدہ کروٹ دی اور اسے کچھ عرصہ شمالی ہندوستان میں بھی خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ پنجاب کے مزاج میں اپج اور جدت کا وافر عنصر موجود ہے۔ ترقی پسند تحریک کو اوائل میں پنجاب میں تقویت حاصل ہوئی تھی۔ تاہم یہ اس بے رنگی کے ساتھ زیادہ دور تک نہ چل سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے مزاج میں محمد حسین آزاد نے جو جمالیاتی رجحان پیدا کیا تھا اس نے بعد میں مخزن کی تحریک کو جنم دیا۔ اردو نظم کے افق پر علامہ اقبال پر حفیظ جالندھری اور ظفر علی خان ابھرے جدید اردو نظم کی تحریک کو کروٹ ملی۔ نثر میں یہ ورثہ ادبی دنیاکے ذریعے تقسیم ہوا۔ ادبی دنیا کی وساطت سے یہ اسلوب وزیر آغا تک پہنچا ہے۔۴۱

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں لسانیاتی نظریات کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی ان کا نکتہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ تخلیق کے ایک مکتوب میں وہ اس پر بحث کرتے ہیں جب ستار طاہر صاحب جو کہ تخلیق میں فٹ نوٹس لکھا کرتے تھے مولانا مودودی کی ایک تصنیف جو انھوں نے مدن موہن مالویہ کے بارے میں لکھی تھی اس پر فٹ نوٹس میں لکھا کہ ”برصغیر میں پاکستان کے

معرض وجود میں آنے سے پہلے ہندوؤں کی ترقی کے لیے کام کرنے کا ایک ہی مفہوم تھا مسلمانوں کو نقصان پہنچانا۔"

ڈاکٹر انور سدید نے ستار طاہر کی اس رائے سے اختلاف کیا اور مختلف مثالوں کے ذریعے واضح کیا۔ بہت دفعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہنماؤں نے مخلص کوشش کے ذریعے دونوں قوموں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ان میں سرسید احمد خان کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے ابتدا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دی تھی۔اسی طرح اقبال نے بھی ابتدا میں ہندوستان کو ہی اپنا وطن قرار دیا۔قائد عظم نے بھی کانگریس کے ساتھ مل کر کام کیا۔ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سے راہنماؤں نے بھی یہ حکمت عملی اپنائی۔ڈاکٹر انور سدید نے لکھا:

> ۱۹۱۹ء میں برصغیر کے بیشتر سیاسی راہنما ہندوؤں کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ابتدا میں سرسید احمد خان نے بھی مسلمانوں کے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے راجہ رام موہن رائے کی حکمت عملی کو اپنایا تھا۔راجہ رام موہن رائے وہی ہندو روشن خیال تھے جو بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ لڑنے کے لیے لندن گئے تھے۔ اردو کے سلسلے پر سرسید کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ دو قومیں اب اکٹھا کام نہیں کر سکتیں اور آج انہیں توکل ضرور یہ علیحدہ ہو جائیں گی۔اتنے واضح اظہار کے باوجود اقبال نے ابتدا میں ہندوستان کے ہر ذرے کو خاک وطن نہیں بلکہ دیوتا قرار دیا۔قائد اعظم نے کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنے کی حکمت عملی اختیار کی۔اکبر الہ آبادی نے گاندھی نامہ کتاب تصنیف کر ڈالی۔مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جیسے راہنماؤں کو بھی سیاست کی رفتار ہندوؤں کے قریب لے آئی۔ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت جب ان کی گرفتاری عمل میں آئی تو برطانوی حکومت کے خلاف عوامی جذبات نے قائد اعظم محمد علی جناح اور مظہر الحق کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ مسلم لیگ

کو کانگریس کے ساتھ طویل المعیاد معاہدے پر آمادہ کریں۔ اس موقع پر
قائد اعظم کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا گیا۔۴۲

ڈاکٹر انور سدید ستار طاہر کی اس رائے کے خلاف ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل جن لوگوں نے ہندوؤں کی ترقی کے لیے کام کیا ان کا واحد مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ستار طاہر نے مولانا مودودی کی کتاب جو کہ ۱۹۱۹ء میں لکھی گئی تھی اس کے حوالے سے یہ رائے دی اور مودودی کی اس رائے سے شدید اخلاف کیا کہ مدن موہن کو ہندوستان کی کشتی کا ملاح قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس رائے کے خلاف ہیں اور ان کے خیال میں اس لچک موجود تھی اور بعد میں تاریخ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔۱۹۱۹ء کے بعد مولانا مودودی کے خیالات میں تبدیلی دیکھنے میں آئی اور وہ کانگریس اور برطانیہ کے خلاف ہو گئے۔

ڈاکٹر انور سدید مزید لکھتے ہیں:

> مودودی صاحب کی اولین کتاب کی دریافت تحقیق کا موضوع ہے۔۱۹۱۹ء کے بعد مولانا مرحوم کے تصورات میں متعدد مدوجزر آئے انھوں نے ترجمان القرآن میں کانگریس کی حکمت عملی اور برطانوی حکومت پر نکتہ چینی کی۔انھوں نے مقالہ مسئلہ قومیت کی تردید کی اور اسلام کو مسلمانوں کی قومیت قرار دیا۔اس عہد کے حالات وواقعات پر ان کے مضامین رسالہ تاج، مصارف، مخزن، مدینہ اور ترجمان القرآن میں شائع ہوئے۔ یہ سب ۱۹۱۹ء کے بعد کی تحریریں ہیں۔ستار طاہر صاحب کو عملی بحث میں ان کا مطالعہ کر لینا چاہیے تھا۔۴۳

ڈاکٹر انور سدید کی ان آرا کی روشنی میں جہاں قیام پاکستان سے قبل کی سیاسی تاریخ کے کچھ حقائق ہمارے سامنے آئے ہیں وہاں یہ بات بھی ہمارے سامنے آئی ہے کہ ایک محقق اور نقاد کے فرائض کیا ہیں۔ان کا مطالعہ وسیع ہونا چاہیے۔صرف ایک کتاب پڑھ کر اپنی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔تعصب کی عینک اتار کر دیکھنا چاہیے۔ حتی الامکان کوشش کرے کہ قاری تک سچ کو پہنچائے۔اس کے ذہن کو الجھائے نہیں۔ بحث کو دلائل کی روشنی میں سامنے لائے۔ ڈاکٹر انور سدید ستار طاہر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں ستار طاہر صاحب سے گزارش کروں گا کہ قلم برداشتہ غیر مربوط جملے لکھ کر وہ قاری کو انتشارِ خیال کا شکار نہ بنائیں۔ وہ کثیر المطالعہ ادیب ہیں۔ اپنے مطالعے سے کام لیں اور ہمیں تاریخ کا ایک مربوط مقالہ عطا کریں۔ جس میں بحث سیاق وسباق سے روشن ہو وہ بے شک مودودی صاحب ہی کو موضوع بنائیں۔ انہیں غیر جذباتی آنکھ سے دیکھیں اور ان پر جلاد کے قلم سے ،خانہ فرسائی کریں لیکن بحث کسی ڈھنگ سے تو آگے بڑھے۔ نتائج کسی دلیل سے تو سامنے آئیں۔۴۴

نقاد کو بلاخوف وخطر حقائق قاری تک لانے چاہییں۔ اس کو اس بات کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ کون اس کے سچ سے ناراض ہو گا اور کون راضی۔ کیونکہ نقاد اور محقق کا مقصد ہی قاری تک حق بات کی ترسیل ہے۔ اگر وہ اس مقصد کو پورا نہیں کرتا تو اس کے قاری کو اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ایسا نقاد بجائے قاری کی الجھنوں کو دور کرنے کے لیے اس کو مزید الجھن کا شکار کر دیتا ہے۔

محمد عالم خان جنھوں نے ادبی اداروں کے کردار پر سوال اٹھایا لیکن اس سوال کا جواب قاری تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوئے وہ اس بات کا جواب قاری کو نہیں دے سکے۔ ادبی اداروں سے مراد کون سے ادارے ہیں اور اس کے ورکرز اس کا بجٹ کہاں کرتے ہیں؟ وہ ضروریات کے پجاری کیوں ہیں؟ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں محمد عالم خان میں بحیثیت نقاد اتنی ہمت ہونی چاہیے تھی کہ وہ ان لوگوں کو بے نقاب کرتے جو اس سب کے ذمہ دار ہیں اور بلاخوف وخطر حق بات سامنے لاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہی ان کا فرض تھا۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

محمد عالم خان نے ایک نازک موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ نئی صورت حال میں ادبی اداروں کا کردار واضح نہیں کر سکے۔ انھوں نے نئی صورت حال کی توضیح نہیں کی۔ نیز یہ بات بھی منکشف نہیں ہوتی کہ ادبی اداروں سے ان کی کیا مراد ہے۔ آپ کے اٹھائے ہوئے سوال پر

> بھی افراط سے روشنی ڈالی جا سکتی تھی کہ اداروں کانو سومن لوہا کون کون سے چوہے کھا جاتے ہیں، لاکھوں کروڑوں کا بجٹ کہاں جاتا ہے؟ ادب کے بجائے اسٹبلشمنٹ کی خدمت کیوں زیادہ ہوتی ہے؟ لیکن محمد عالم خان تو اس بحث کی طرف آئے ہی نہیں۔ وہ ایک اچھے نقاد کی صورت میں ابھر رہے ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ وہ بہت سہمے ہوئے، بہت ڈرے ہوئے نقاد ہیں۔ حق بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سماج کے درے سے خوف کھاتے ہیں۔ الزام لگاتے ہیں لیکن مجرم کی نشاندہی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی ذات میں الجھ جاتے ہیں۔ اور قاری بھی ٹامک ٹوئیے مارنے لگتا ہے۔۴۵

ڈاکٹر انور سدید خود بھی ایک بے باک اور حق گو نقاد تھے جو کہ دوسروں کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر لکھا کرتے تھے اس لیے وہ دیگر ناقدین کو بھی اسی طرز کی طرف مائل کرتے ہیں۔

تنقید کے باب میں ایک اور طرز جس کا اضافہ ڈاکٹر انور سدید ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ نقاد جو کچھ لکھے قاری اس کو آسانی سے سمجھ بھی سکے یعنی تنقید کو اپنا ابلاغ پورا پورا کرنا چاہیے نہ کہ اتنی مشکل زبان اختیار کی جائے جو کہ قاری کی سمجھ سے باہر ہو اور اس کے لیے قاری کو مشکل کا سامنا کرنا پڑے اور یہی مشکل قاری کو اکتاہٹ کا شکار کر دے گی اور وہ تنقیدی کتابوں سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ ہمارا ناقدین نے جب مغربی تنقیدی دبستانوں کا مطالعہ کیا تو ان کی دیکھا دیکھی بہت سی مشکل اصطلاحات کو اردو تنقید میں برتنا شروع کر دیا اور تنقید کو مشکل پسندی کی راہ پر ڈال دیا۔ ایک لفظ کے لیے دس دس اصطلاحات نکال لی گئیں۔ اس قسم کے تنقیدی رویے کے خلاف جمیل آذر اور دیگر بہت سے لوگوں نے علم بغاوت بلند کیا اور اس بات کا مطالبہ کیا تنقیدی زبان آسان اور عام فہم ہونی چاہیے جو کہ قاری کو تنقید کی جانب مائل کرنے میں معاون ثابت ہو۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مضامین چھپ چکے ہیں جن کی پذیرائی جناب محمد کاظم اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی کی ہے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد کا اسلوب تنقید قدرے مختلف تھا۔

انھوں نے بھی اس کی حمایت کی نہ کہ نقاد جو کچھ بھی لکھے وہ قاری پر اپنا پورا ابلاغ کرے۔ تنقید کی اس بنیادی ضرورت سے انکار ممکن نہیں لیکن بعض نقادوں نے مغرب کے تنقیدی دبستانوں کے مطالعے بعد جب اردو قاری کو ان سے متعارف کرانا چاہا تو بے حد مشکل اصطلاحات اور نامانوس الفاظ کا سہارا لیا۔ جمیل آذر صاحب نے اس قسم کی تنقید کے خلاف ہی علم بغاوت بلند کر رکھا ہے۔۴۶

نقاد اور تنقید کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جب بھی کوئی اچھی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو اس کی مقبولیت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر ناقدین تبصرے لکھیں۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگ اس کتاب کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کبھی بھی کوئی ادیب ناقدین کو اپنی کتاب پر تبصرے سے نہ روکے۔ کیونکہ جن کتابوں پر ناقدین تبصرے لکھتے ہیں وہ زیادہ مقبول ومعروف ہوتی ہیں اور نقادوں کے تبصرے ادیبوں کے لیے اعزاز کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ وہ ادیب جو کہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا فن تبصرے کا محتاج نہیں وہ بھی بعد میں نقادوں کو تبصرے کی یاددہانی کراتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ناقدین کا تبصرہ کسی بھی کتاب کو مقبول عام کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

جس کتاب کو اچھا نقاد مل جائے وہ کتاب جلد ہی قاری کے مطالعے کی ٹیبل کا حصہ بن جاتی ہے اور اس کتاب پر کی گئی تنقید کی مدد سے نہ صرف وہ مصنف خود مستقبل کے لیے راہنمائی لیتا ہے بلکہ اس پر کی گئی تنقید کی مدد سے دیگر مصنفین بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ایک مکتوب میں اس کی اہمیت پر بات کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

ممتاز مفتی صاحب بھی اپنی زندگی میں فرماتے تھے کہ ان کا فن نقاد کا محتاج نہیں لیکن ان کی نئی کتاب چھپتی اور تبصرے میں دیر ہو جاتی تو بار بار یاد دہانی کراتے۔ عبداللہ حسین نے بھی اپنے ایک ناول کے پیش لفظ میں فرمایا تھا کہ اس پر ایک متعین عرصے تک کوئی نقاد مضمون نہ لکھے۔ نقادوں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔ چنانچہ ان کا یہ ناول اب اداس نسلیں جیسے تذکرے سے محروم ہے۔ میرے خیال میں تخلیق کار کو نقاد کی آزادی کا

اظہار پر پابندی ہرگز نہیں لگانی چاہیے۔ترقی پسند تحریک کے ادیب تو فخر سے کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے نقاد خود لائے ہیں۔ان نقادوں کی وجہ سے ہی ترقی پسند ادیبوں کا ڈنکا آج بھی بجتا ہے۔۴۷

ڈاکٹر سدید کے ہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ان کے مکتوبات تجزیاتی صورت میں ہیں اس لیے ان میں ملکی، معاشی، سیاسی اور ادبی ہر طرح کی صورتحال پر تجزیہ ملتا ہے۔

ادب کی تمام اصناف پر انور سدید نے قلم فرسائی کی اور بہت بہترین انداز میں کی۔اس لیے تمام اصناف کا بخوبی علم رکھتے تھے۔ان کے مکتوبات میں تمام اصناف ادب پر بھی بہترین انداز میں بحث ملتی ہے۔وہ دوسرے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی، راہنمائی اور داد دینے میں پیش پیش رہتے تھے۔چاہیے غزل ہو یا نظم، ڈرامہ ہو یا کہانی، افسانہ ہو یا انشائیہ سب ان کے احاطہ علم میں آتے تھے۔اپنے ایک مکتوب میں ''تخلیق'' کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مقصود الٰہی شیخ کے افسانے ''برسورلے نینوامورلے'' میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے دھارے آپس میں مدغم ہو گئے ہیں۔میں سلمٰی اعوان کا افسانہ ''اول الذکر'' کا اینٹی تھیس معلوم ہوتا ہے، اور اختتامی جملہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ کان کے پردے پھٹ سکتے ہیں۔شاید محترمہ سلمٰی اعوان کو اپنی بات بہرے معاشرے تک پہنچانے کے لیے آواز کا لہرا بہت اونچا اٹھانا پڑا ہے۔ ''مائی نی'' کے مصنف محمد الیاس نے گزشتہ برس متعدد افسانے لکھ کر اپنا تعارف عمدگی سے کرایا۔میرا خیال ہے کہ اس برس ان کی شناخت کو مستحکم کرنے میں ان کا فن معاونت کرے گا۔''مائی نی'' ان کا اچھا افسانہ ہے۔۴۸

اس تمام تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید افسانے کا علم رکھتے تھے اور دوسروں کے افسانے بغور پڑھا کرتے تھے۔اس تجزیے میں ''بہرہ معاشرہ'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔جو یہ ثابت کرتی ہے انور سدید کے خیال میں معاشرہ بے حسی کا شکار ہے لوگ مطلبی ہیں اور اپنا فائدہ سوچتے ہیں۔نفا نفسی کا عالم ہے جس میں دوسروں کی آہیں اور سسکیاں دب کر رہ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ وہ مصنف محمد الیاس کو مبارک باد دے رہے ہیں کہ انھو ں نے افسانے کی دنیا میں اپنی شناخت کروا لی ہے جو کہ خوشی کی بات ہے اور ایک اچھا اضافہ ہے۔

ایک اور تجزیے میں ڈاکٹر انور سدید افسانے میں کرداروں کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پروفیسر زہیر کنجاہی صاحب ''قوتو'' میں کردار نگاری کے گوشے میں خصوصی طور پر نمایاں محسوس ہوئے۔ ہموار معاشرے میں کردار بالعموم گم جاتے ہیں۔ لیکن جب معاشرہ اضطراب کی لہروں میں ڈول رہا ہو تو بلند پایہ کردار زندگی کی کشتی کو منجدھار سے نکالنے کا کام دیتے ہیں۔ زہیر کنجاہی نے کردار کی پیشکش میں فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔۴۹

اچھے اور مضبوط کردار معاشرے میں لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے کردار ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ یہ کردار زندگی کی مشکلات کو صبر اور حوصلے کے ساتھ بسر کرنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ اگر کردار نگاری کمزور ہو تو افسانہ نگار کامیاب نہیں ہو سکتا۔

انشائیہ نگاری کے میدان میں بھی ڈاکٹر انور سدید نے بہت سے کامیابیاں حاصل کیں اور بہت سے اچھے انشایئے لکھے۔ اس موضوع پر ان کی کتاب ''انشائیہ اردو ادب میں'' بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو میں ڈاکٹر انور سدید اپنے استاد محترم ڈاکٹر وزیر آغا کو انشایئے کا امام مانتے ہیں اور ان ہی انشائیوں کو انشائیہ مانتے ہیں جو کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریف پر پورا اترتے ہوں۔

''نالہ دل'' میں شامل انشائیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انشائیہ کے باب میں مشتاق احمد کا خط لکھنا اور منور عثمانی کا قابل واپسی خط انشائیہ کی اس تعریف پر پورے اترتے ہیں جو مونتین سے لے کر جسٹرٹن تک اور اردو میں ڈاکٹر وزیر آغا سے لے کر ڈاکٹر ناصر عباس نیئر تک نے متعین کی ہے اور جس پر اب تک گرداڑائی جاری ہے۔ لیکن ''تصویر کی آفتیں'' اس تعریف پر پورا نہیں اترتا۔۵۰

اپنے ایک اور مکتوب میں وہ انشائیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے ایک سابقہ پرچے میں ''نالہ دل کو'' انشائیہ کا علمبردار قرار دیا ہے اور یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ہر شمارے میں انشائیہ کا الگ گوشہ بنا کر نالہ دل اس صنف لطیف کی خدمت دل وجان سے کر رہا ہے۔طمانیت کی بات یہ ہے کہ اس ضمن میں آپ کو سلیم آغا قزلباش کا تعاون حاصل ہے اور وہ مغرب کے نمائندہ انشائیہ نگاروں کے فن پاروں کے تراجم سے نئے لکھنے والوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔اس شمارے میں انجم نیازی صاحب کی آمد خوش آئند ہے۔وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے تربیت یافتہ ہیں اور انشائیہ کے صحیح مزاج دان ہیں۔۵۱

انشائیہ ایک قدرے جدید صنف ادب ہے۔اس صنف کی ترقی پر ڈاکٹر انور سدید نے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار ہے اور مجلہ ''نالہ دل'' کی تعریف کی ہے کہ انھوں نے انشائیہ کا پرچم بلند کر رکھا ہے اور اس سلسلے میں نالہ دل کے ساتھ سلیم آغا قزلباش جو ڈاکٹر وزیر پر آغا کے صاحبزادے ہیں ان کے تعلق کو سراہاہے۔کہ انشائیہ کے ساتھ ان کی وابستگی نئے لکھنے والوں کی راہنمائی کرتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید''غزل'' کا علم بھی رکھتے تھے اور مجلوں میں شائع ہونے والی غزلوں پر بہت اچھے تبصرے بھی کیا کرتے تھے اور یہ تبصرے غزل کے ساتھ ان کی وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔

غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تخلیق کی غزلوں میں حالیہ عصری واقعات کا عکس بھی ہے اور ردِ عمل بھی اور ان میں لمحے کی چاپ بھی سنی جا سکتی ہے۔مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

سفر نما بھی ہمارا وہی ہے اس نے
غلط اشارہ بھی سمت سفر میں رکھا ہے (نسیم سحر)

ہم پر پیہم اثر رہے ہیں عذاب

اور وہ اپنی آن بان میں ہے (منظر ایوبی)

ایوان مملکت کے بنے رازدار وہی

جن کے تعلقات تھے قوم نمود سے (وفا براہی)

جس زمین پر رہتی ہوں سب وہاں یہ اپنے ہیں

خود ہی تم سمجھ جاؤ سازشوں کے پس منظر (یاسمین سیف)

یاسمین سیف صاحبہ نے مشکل قافیوں کی غزل لکھی ہے اور قافیوں کو پس منظر کی ردیف کے ساتھ بڑی خوبی سے منسلک کیا ہے۔ماشاء اللہ!۵۲

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں اس دور کی غزل میں معاشرتی حالت کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔لوگوں کی مشکلات غزل کا حصہ بن چکی ہیں۔ایک اور جگہ چھوٹی بحر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

گزشتہ کچھ عرصے سے چھوٹی بحر قیامت ڈھا رہی ہے۔بلکہ نسیم کا یہ شعر شاید اظہر جاوید کے تجربات حیات سے کشید کیا گیا ہے۔

انکساری سمٹ کر اپنی

حاشیے سے نکل رہے ہیں ہم۵۳

ایک اور جگہ وہ وزیر آغا کی نظم پر جو کہ تخلیق میں شائع ہوئی پر تبصرہ کرتے ہیں۔وزیر آغا عام طور پر مختصر نظمیں لکھتے ہیں مگر یہ ایک طویل نظم ہے اور اس نظم کا عنوان ''آدھی صدی کے بعد'' ہے۔اس نظم میں ڈاکٹر وزیر آغا کی محبت جو ان کو اپنے گاؤں سے ہے واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے بیٹے سلیم آغا کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں لاہور منتقل ہو گئے تھے۔لیکن گاؤں کی یاد کبھی ان کے دل سے محو نہ ہونے پائی۔شہر کی چکا چوند روشنیاں ان کو اپنی گرفت میں نہ لے سکیں۔گاؤں کی مٹی کی خوشبو ہمیشہ ان کے من میں رچی ہی رہی۔وہ کبھی شہری زندگی سے سمجھوتہ نہ کرپائے۔

جوں ہی ڈاکٹر وزیر آغا کو فرصت نصیب ہوئی وہ اپنے آبائی گاؤں کی طرف پلٹے اور یوں پلٹے کے ان کی ساری خوشیاں اور سکون جو کہ شہری زندگی نے چھین لیا تھا واپس انھوں نے پا لیا۔ ڈاکٹر انور سدید اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس پرچے کی ایک اور اہم چیز وزیر آغا کی نظم ''آدھی صدی کے بعد'' ہے۔ آغا صاحب بالعموم مختصر نظم لکھتے ہیں۔ یعنی اتنی مختصر کہ تخلیق کے نصف کالم میں سما جائے اور بھرپور تاثر چھوڑ دے۔ یہ نظم خود ان کی زندگی کی نصف صدی پر محیط ہے اور اشاروں اشاروں میں ان پر گزرنے والی کیفیات سے آشنا کر دیتی ہے۔ چنانچہ آخر میں جب وہ کہتے ہیں کہ آج آدھی صدی کی مسافت پر پھیلے ہوئے/ ایک لمبے سفر سے سے لوٹا ہوں میں/ اور گاؤں/ آنسو موٹے سے قطرے کی صورت/ مری بھیگی پلکوں کی چلمیں سے لگ کر کھڑا ہے۔ تو صاف نظر آتا ہے کہ زمین انہیں واپس بلا رہی ہے اور شہر کی بے مثال روشنیاں ان کے تصورات میں جاوداں حیثیت اختیار نہیں کر سکیں۔ میں ان کی گاؤں کی طرف مراجعت کا عرصے سے منتظر ہوں اور یہ نظم ان کی داخل کی کیفیت کو بالواسطہ طور پر محو تک بڑی خوبی سے پہنچا رہی ہے۔ ۵۴

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ نثری نظم زوال کا شکار ہے۔ اب تک اس میں بہت کم اچھا کام سامنے آیا ہے۔ اس صنف کی عروج وترقی کے لیے بہت کم مخلصانہ کوششیں سامنے آئی ہیں۔

نثری نظم کو آسان سمجھ کر اس میں بہت سے لوگوں نے اپنے فن کو آزمانے کی کوشش کی ہے اور اپنے کام کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا لیکن ان کی یہ کوشش زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتیں۔

ڈاکٹر انور سدید نثری نظم کا المیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> نثری نظم کا المیہ یہ ہے کہ یار لوگوں نے اسے مقبول بنانے کے لیے سیاسی حربے تو افراط سے استعمال کیے۔ اخبارات اور رسائل میں بیان بازی بھی بہت کی، ان لوگوں کو جو تخلیقی طور پر بانجھ پن کا شکار ہیں۔ شاعر کہلوانے

کے ناتے اپنا ہم نوا بھی بنا لیا۔ مگر تخلیق کا ایک اعلیٰ نمونہ بھی پیش نہ کیا جا سکا۔۵۵

اپنے ایک اور مکتوب میں ڈاکٹر انور سدید آزاد نظم اور پابند نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نظموں کے حصے میں طالب انصاری نے سب سے پہلے اپنی نظم ''ہوس اپنے تیور بدلتی نہیں ہے'' اپنی طرف راغب کیا۔ وجہ شاید یہ ہے کہ طالب انصاری آزاد نظم کے اس مزاج سے آشنا ہیں جو انگریزی شعرا نے استعمال کیا ہے۔ ابتدا میں معاشرے کے گردوپیش سے کوئی واقعہ انہیں متوجہ کرتا ہے۔ لیکن اختتام اس نتیجے کی طرف لاتا ہے جو وہ اول الذکر سطور سے اخذ کر چکے ہوتے ہیں۔ اس نظم کی آخری سطر میں معنی خیز ہیں:

زمانہ ازل سے بدلتا چلا آرہا ہے

ہوس اپنے تیور بدلتی نہیں ہے

پابند نظموں میں مجھے نغمہ نیازی کی نظم اچھی لگی۔ مسدس کی ہیت میں شاعرہ کے تصورات کی روانی متاثر کرتی ہے۔۵۶

خاکہ نگاری کو شروع میں سوانح نگاری ہی تصور کیا جاتا تھا۔ اگرچہ خاکہ نگاری کوئی قدیم صنف ادب نہیں ہے لیکن اس نے بہت جلد ادب میں اپنا الگ مقام ومرتبہ بنا لیا ہے۔ اردو میں اس فن کا امام مرزا فرحت اللہ بیگ ہے اور ان کا خاکہ مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی اردو کا پہلا خاکہ ہے۔ اردو ادب میں یہ صنف انگریزی سے آئی ہے اور اس کو Sketch Writing کہا جاتا ہے۔ جب کسی کا خاکہ لکھا جاتا ہے تو اس طرح لکھا جاتا ہے کہ وہ انسان مجسم حالت میں سامنے ہو، ہنستا، بولتا اور بات کرتا محسوس ہو۔ اس میں شخصیت کے اہم اور امتیازی پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے چاہے وہ پہلو اچھے ہوں یا برے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں جہاں تنقیدی، تحقیقی بحث ملتی ہے وہاں مختلف اصناف ادب کا تجزیہ بھی ملتا ہے۔ اپنے ایک مکتوب میں ممتاز مفتی اور ابدال بیلا کی خاکہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس کے خاص پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ممتاز مفتی اور ابدال بیلا کی خاکہ نگاری پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

ڈاکٹر ابدال بیلا صاحب تو ممتاز مفتی (مرحوم) کے فن کے وارث ہیں ان کے مضامین سے ممتازیت بھی نمایاں ہوتی ہے اور مفقیت بھی اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ وہ معصوم بچے جیسی سادگی سے سچ لکھ جاتے ہیں۔ ایک سچ جو شاخ پر پکے ہوئے آم کی طرح ٹپک پڑا ہے... حسب ذیل ہے:

بشری رحمان پیدائشی مقرر ہے۔ اسے اگر مائیکرو فون پر کھڑا کر دیا جائے تو یہ مولویوں کی طرح مائیکرو فون نہیں چھوڑتی چاہے سننے والوں کی ساری نمازیں چھوٹ جائیں یا ٹرینیں نکل جائیں۔ ان کی تقریریں سنتے ہوئے اور انہیں دیکھتے ہوئے میری کئی نمازیں قضا ہوتی ہیں۔

ممتاز مفتی زندگی کے آخری دور میں خاکہ نگاری کی طرف آگئے تھے اور انھوں نے پیاز کے چھلکے، اوکھے لوگ وغیرہ خاکوں کی بے مثال اور لاجواب کتابیں لکھیں۔ ابدال بیلا اس صنف کی طرف جوانی میں آئے۔ ان کے مشاہدے کی دھار تیز ہے۔ انیس رانی کنگن پور۔ بشری رحمن جیسے مزید خاکے لکھے چاہیے۔۵۷

ڈاکٹر انور سدید ادبی مجلوں کے بہت باریک بین قاری تھے۔ وہ ہر تحریر کا بغور جائزہ لیا کرتے تھے اور اس کے بعد اگر ان تحریروں میں کسی قسم کی کوئی غلطی ملتی تو اس کی نشان دہی اپنے مکاتیب میں کیا کرتے تھے اور اس عمدگی سے کرتے تھے کہ اگلے بندے کو گراں بھی نہ گزرے اور اس تک اور تمام قارئین تک حقیقت بھی پہنچ جائے۔

"الحمرا" میں قاضی اختر جوناگڑھی صاحب نے فرخندہ لودھی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا اور اس ذکر میں انھوں نے کچھ واقعاتی غلطیاں بھی کی ہیں۔ مثال کے طور پر جوناگڑھی صاحب نے فرخندہ لودھی کی وفات دسمبر ۲۰۰۹ء میں بتائی۔ جبکہ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق ان کی یادداشت ان کو دھوکہ رہی ہے۔ فرخندہ لودھی کی تاریخ وفات دسمبر ۲۰۰۹ء نہیں بلکہ مئی ۲۰۱۰ء ہے۔

فرخندہ لودھی کے علاوہ قاضی اختر جوناگڑھی نے وزیر آغا کا بھی ذکر کیا اور اس میں بھی انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے بنگلے کی اوپر والی منزل میں رہتے تھے اور زندگی میں جب

آخری وقت قریب آیا تو ضعیفی نے ان کو مغلوب کر کے رکھ دیا۔ اس وجہ سے وہ ویل چیئر (Wheel Chair) استعمال کرتے تھے۔

لیکن ڈاکٹر انور سدید نے یہاں بھی قاضی اختر جوناگڑھی کی اصلاح کی کہ وزیر آغا نے زندگی میں کبھی ویل چیئر استعمال نہیں کی اور نہ ہی کبھی وہ اپنے گھر کی بالائی منزل میں رہے۔ بلکہ ہمیشہ خود زمینی منزل پر قیام کیا جبکہ بالائی منزل مہمانوں کے لیے مختص تھی۔ قاضی اختر جونا گڑھی کی اصلاح کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> قاضی اختر جوناگڑھی نے مسعود زیدی، فرخندہ لودھی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقاتوں کی تجدید کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اکتوبر ۲۰۰۹ء میں بھارت گئے اور ڈیڑھ ماہ بعد واپس آئے۔ گویا واپسی پر نومبر یا دسمبر ۲۰۰۹ء میں ہوئی ان کا ارشاد ہے کہ وہ واپسی پر بیگم شاہین زیدی کے ہمراہ واپڈا ٹاؤن گئے تو فرخندہ لودھی اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں۔ یہاں انہیں حافظہ دھوکا دے گیا ہے۔ فرخندہ لودھی ۵ مئی ۲۰۱۰ء کو فوت ہوئی تھیں۔ وزیر آغا صاحب کے بارے میں انھوں نے کہا کہ وہ اپنے وسیع وعریض بنگلے کی بالائی منزل پر مقیم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب نے ہمیشہ اپنے بنگلے کی زمینی منزل پر ہی قیام کیا اور بالائی منزل مہمانوں کے لیے مخصوص تھی۔ مزید برآں انھوں نے زندگی کے آخری لمحات تک وہیل چیئر کبھی استعمال نہیں کی۔ میں ان سے اپنی آخری ملاقات کی تفصیل الحمرا میں پیش کر چکا ہوں۔ ۲۰ اگست ۲۰۱۰ء کو وہ اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ لیکن راقم اور ڈاکٹر انور محمود خالد کے ساتھ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پہلے اٹھ کر بیٹھ گئے اور پھر پلنگ کے ساتھ رکھی ہوئی آرام کرسی پر نشت نیشن ہو گئے۔۵۸

مذکورہ بالا حوالہ ڈاکٹر انور سدید کی ادب اور ادیب کے ساتھ گہری دلچسپی کا عکاس ہے۔ اسی طرح "نالہ دل" کے مکتوب میں حفصہ پروین نے ہاجرہ مسرور کے فن اور زندگی کے مختلف گوشوں پر بحث کی لیکن اس بحث میں بھی انھوں نے بہت سی واقعاتی غلطیاں کی ہیں جن کی ڈاکٹر

انور سدید نے نشاندہی کی ہے۔مثال کے طور پر صفہ پروین نے ہاجرہ مسرور کے والد کا نام صہور احمد خان لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ان کے والد کا نام ظہور احمد خان نہیں بلکہ تہوار احمد خان تھا۔ اس کے علاوہ ان کی تاریخ وفات میں بھی غلطی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں لکھتے ہیں:

> محترمہ فصہ پروین نے ہاجرہ مسرور کو ان کی وفات کے بعد یاد کیا، اور ان کے فن کے نادر گوشوں کا دقیع احاطہ کیا ہے۔ تاہم واقعاتی غلطیوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔حاجرہ مسرور کے والد کا نام تہوار احمد خان تھا۔(صہور احمد خان غلط لکھا گیا ہے) آئی آر رحمان کے بقول وہ بیمار جانوروں کا علاج کرتے تھے۔لیکن شکار بھی کھیلتے تھے۔ہاجرہ مسرور کی عمر صرف آٹھ برس تھی کہ ان کے والد کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہو گیا۔۵۹

یہ تجزیاتی مکتوبات اس بات کے شاہد ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید کی زندگی میں ادب کو کس حد تک عمل دخل تھا۔تمام اصناف سے وابستگی ادب سے محبت کی شاہد ہے۔ادبی دنیا میں اس قدر کامیابیاں ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔وہ لوگ جن کے دل میں ہوس ہو جو پیسے کے پجاری ہوں ان کا ادبی سفر ان کی زندگی تک ہی محدود ہوتا ہے اور ان کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔دوسری طرف ڈاکٹر انور سدید جیسے لوگ جو ادب کے سچے شیدائی ہوں ان کا یہ سفر ان کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور ان کا نام لوگوں کے درمیان زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب اردو ادب کی مختصر تاریخ جب منظر عام پر آئی تو اس کو جہاں بہت پذیرائی ملی وہاں اس پر تنقید بھی کی گئی جو کہ انور سدید نے بہت تحمل سے برداشت کیا اور مخالفین کو صبر سے جواب دیئے۔ان کے خیال میں تاریخ کا کام ایک مشکل ترین امر ہے اور کوئی بھی یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ اس کو اول درجے کے تمام مواد تک رسائی حاصل ہو گئی ہے۔

اس سے قبل بھی رشید حسن خان نے تحریک علی گڑھ کی تاریخ ادب اردو اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب پر مقالات لکھے اور اسی طرح سکسینہ اور ڈاکٹر صادق کی تاریخ پر والف رسل کے

اعتراضات اس بات کا ثبوت ہیں کہ کوئی بھی تاریخی کتب مکمل طور پر کامل نہیں ہو سکتی ہیں۔ نقادوں کی تنقید کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ادب میرا شوق ہے، پیشہ یا کاروبار نہیں کہ حرف تنقید و تنقیص سے میری مارکیٹ خراب ہو جائے گی۔ یا ادبی مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ میں نے ادب کو مستقبل پر کمنڈ ڈالنے کا وسیلہ کبھی نہیں سمجھا۔ میں ہر بات سننے کے لیے کان کھلے رکھتا ہوں اور غلطی کی صحیح نشاندہی کر دی جائے تو اس کے لیے ممنونِ احسان ہوتا ہوں اور اس سے استفادہ بھی کرتا ہوں۔۶۰

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں ادب اور ادبی معاشرے کی پراگندہ حالت کا مرثیہ بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید اس صورت حال پر بہت افسردہ اور دلبرداشتہ دکھائی دیتے ہیں۔ان کے خیال میں ادیب جس کو حق کا علمبردار ہونا چاہیے جس کو اپنے قلم کے ذریعے اس معاشرے کو سنوارنا ہے خود اخلاقی زوال کا شکار ہے۔ہوس کے حصول کے لیے اخلاق کا جنازہ نکالا جا رہا ہے اور ادب کی بولی لگائی جا رہی ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر انور سدید خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کو گمنامی کی زندگی عطا کر تاکہ کوئی آلودگی ان کے دامن کو داغدار کرنے کا باعث نہ بنے۔

اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ملتان سے ایک شاعرہ افشاں عباس ابھری تھی۔ محترم احمد ندیم قاسمی نے اس کے سر پر تاج عظمت رکھا اور اسے مستقبل کی قراۃ العین حیدر قرار دے دیا۔ اس بے چاری کا باپ مر گیا تو اس کی شاعری میں ملتان کے شعرائے کرام اپنے اپنے جرثوموں کا اعلان کرنے لگے اور اب کہا جا رہا ہے کہ پروین شاکر اور منصورہ احمد کے پردے میں بھی کوئی اور بول رہا ہے... شاعروں اور شاعرات کا ذکر تو ایک طرف اس ملک میں تو نثری ادب حتیٰ کہ تحقیقی ادب بھی وسیع پیمانے پر فروخت ہو رہا ہے اور قیمت جنس کی صورت میں وصول کی جا رہی ہے۔ مجھے زندگی کے ستر ویں برس میں آکر معلوم ہوا کہ ادبی معاشرہ شاید سب سے زیادہ آلودہ معاشرہ ہے۔ یہاں اب

ادبی طوائفیت کا دور دورہ ہے۔ افسوس صد افسوس! اور اب دعا کی جا سکتی ہے:

"اے خدا! مجھے لکھنے کی توفیق دے۔لیکن مجھے گمنامی کی زندگی عطا کر۔"۶۱

کہا جاتا ہے کہ دریا میں رہتے ہوئے مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔یعنی جس کے پاس طاقت ہو اور اختیار ہو تو وہ اس کا بے جا استعمال کرتا ہے وہ کبھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ کوئی اس کے خلاف جائے اس کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے۔ہر سیاہ وسفید میں اس کا ساتھ دے۔ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں یہی صورتحال ادبی معاشرے کی بھی ہے۔یہاں ایک مخصوص طبقہ ہے جو کہ پورے ادبی معاشرے کا کرتا دھرتا بنا ہوا ہے وہ اختلاف رائے کو کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہیں۔جو کوئی ان کے نظریات کے خلاف جائے ان کا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ادبی دنیا میں اجارہ داری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پچھلے دنوں کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو عجیب رائے سننے کا موقع ملا کہ بعض مدیران کرام اردو ادب میں بھی جاگیردارانہ نظام کا نفاذ چاہتے ہیں۔
>
> ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ "جاگیردارانہ نظام" عرصے سے نافذ ہے اور اس میں مدیران جرائد ہی نہیں بعض سینئر ادبائے کرام بھی شامل ہیں۔اور وہ اختلاف رائے کو بالکل برداشت نہیں کرتے۔اس قسم کے باغی کو سزا دیتے ہیں۔شاعروں کی فہرست میں سے اس کا نام کٹوا دیتے ہیں۔ ادبی اخبارات میں اس کے خلاف بیان بازی شروع کرا دیتے ہیں۔ ان صاحب نے خود مجھ سے سوال کیا۔
>
> "انور سدید" کیا تم خود آزادی کا سانس لے رہے ہو؟ کیا تمہارا استحصال نہیں کیا جا رہا ہے؟ اب میں اپنی غلامی پر غور کر رہا ہوں۔دعا کیجیے کہ کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں۔۶۲

ایک اور مکتوب میں پروین عاطف کے سفرنامے کو زیر بحث لاتے ہیں۔اس سفر نامے میں علاقائی اور مذہبی عصبیت کو زیر بحث لایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ بھارت میں افسانوں کی پہچان ان کے مذہب اور صوبوں سے ہے۔دیگر مذاہب اور صوبوں کے لوگوں کو وہ لوگ کسی صورت

برداشت نہیں کرتے۔ اسی مذہبی اور صوبائی عصبیت کی وجہ سے بہت سے جھگڑے ہوئے اور لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ مذاہب میں مختلف درجے ہیں جن میں سب سے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ وہ بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم ہیں۔

اسلام میں ایسے کسی گروہ بندی کی اجازت نہیں برتری کا معیار صرف اور صرف تقوی کو قرار دیا جاتا ہے۔ تمام انسان برابر ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں یہ گروہ بندی نہ صرف عام زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ ادبی دنیا بھی اس کا شکار ہے۔ یہاں ایک گروہ دوسرے کے خلاف صف آزاد دکھائی دیتا ہے۔ کسی کے اچھے کام کی تعریف کرنا گناہ خیال کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> پروین عاطف شاہد اس لیے بھی عبرت حاصل کریں کہ انھوں نے ہندوستان کے جس رویے کا ذکر کیا ہے وہ ہماری ادبی دنیا میں ۱۷۳۶ء سے ہی وارد ہو گیا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد تو اسے اتنا فروغ حاصل ہوا کہ اطہر جاوید شاعری میں آسمان کے تارے بھی توڑ لائیں تو انور سدید انہیں بھینے لبوں سے بھی داد نہیں دے گا کیونکہ اطہر جاوید کے خون کا گروپ علیحدہ ہے۔ ۶۲

جہاں ادب میں گروپ بندی کا ذکر آیا تو وہاں وزیر آغا گروپ اور احمد ندیم قاسمی کا ذکر بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر انور سدید کا تعلق ڈاکٹر وزیر آغا کے گروپ سے تھا۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ ڈاکٹر انور سدید وزیر آغا کے گروپ میں صف اول کے سپاہی تھے۔ دوسری طرف قاسمی گروپ میں رطب اللسانوں کا جم غفیر تھا۔ ان میں عطا الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، خالد احمد اور دوسرے بہت سے لوگ شامل تھے۔

ادبی مجلہ ''فنون'' احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت جبکہ ''اوراق'' ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں نکلتا تھا۔ جس میں دونوں گروہ ایک دوسرے کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ ۱۹۶۶ء میں فتح محمد ملک نے جب وہ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کر کے نکلے تو ایک مضمون ''فیض کی دو

آوازیں" اوراق میں شائع ہونے کے لیے پیش کیا۔ فتح محمد ملک میں فطری طور پر ایک تنقید نگار موجود تھا۔ فتح محمد ملک اور احمد ندیم قاسمی میں بہت دوستی تھی اور اس دوستی کی بنا پر وہ اپنا مضمون "فنون" میں شائع کروا سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اوراق کا انتخاب کیا جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے مضمون فیض کی دو آوازیں میں احمد ندیم قاسمی کو فیض سے بڑا شاعر ثابت کرنا چاہتے تھے۔

دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا نہ صرف تخلیقی فنکار تھے بلکہ نابغہ روزگار نقاد بھی تھے۔ لہٰذا انھوں نے جب بھی کبھی کوئی مضمون وغیرہ اپنے رسالے میں شائع کرنا ہوتا تو اس کی نوک پلک درست کرتے اور اس میں موجود قابل اعتراض حصوں کو حذف بھی کر دیا جاتا۔ لہٰذا فتح محمد ملک کا مضمون بھی اشاعت سے قبل جب تنقیدی زاویے سے جانچا گیا تو اس میں کچھ حصے حذف کر دیئے گئے کیونکہ فتح محمد ملک نے تنقید کی دنیا میں نیا نیا قدم رکھا تھا اس لیے ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے مضمون کی اصلاح ضروری سمجھی۔ بعد میں قاسمی صاحب سے محبت کرنے والوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ عمل ان کے لیے گناہ بنا ڈالا اور وقتاً فوقتاً ان کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ادبی رقابت کے باعث اس مضمون میں سے کچھ حصے حذف کر دیئے ہیں:

اس پر ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف ایک مہم شروع کر دی گئی اور ان کو ادب سے دلبرداشتہ کرنے کے لیے بہت سے حملے کیے گئے۔ ان حملوں کی زد میں نہ صرف وزیر آغا خود بھی آئے بلکہ ان کے دیگر احباب جن میں ڈاکٹر انور سدید کا نام بالخصوص شامل ہے وہ بھی اس دشنامی مہم کا حصہ بن گئے۔ ڈاکٹر انور سدید اس جھگڑے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میں ۱۹۶۲ء سے وزیر آغا صاحب کے ایک مجلس نشین کی حیثیت سے اس دشنامی مہم کا مستقل ہدف ہوں جو احمد ندیم قاسمی صاحب کے نیاز مندوں نے گزشتہ بیس برس سے جاری کر رکھی ہے۔ اس کا پس منظر اجمالاً یہ ہے کہ اوراق نے جناب قاسمی صاحب کو فیض سے برتر قرار دینے میں فتح محمد ملک کا ساتھ نہیں دیا تھا اور وہ حصے جن سے قاسمی صاحب آسمان پر چڑھایا گیا تھا قلمزد کر

دیئے گئے۔فٹ نوٹس نگار صاحب نے اس قسم کی تنقید کو ''پھوک دینے'' کا عمل قرار دیا ہے۔ گویا وزیر آغا صاحب نے قاسمی صاحب کے غبارے میں ان کے عقیدت مند فتح محمد ملک کو پھوک دینے کی اجازت نہیں دی تھی کیونکہ غبارہ زیادہ پھوک سے پھٹ بھی سکتا تھا۔چنانچہ قاسمی صاحب ناراض ہو گئے اور وزیر آغا صاحب کو ادب بدر کرنے کی مہم شروع کر دی۔ قاسمی صاحب کے مراعات رسیدہ اور احسانات چشیدہ لوگ اس میں شامل ہیں۔۶۴

فنون قاسمی گروپ کا نمائندہ مجلہ جبکہ اوراق وزیر آغا گروپ کا مجلہ بن کے رہ گیا تھا۔ دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف لکھا جاتا تھا۔چند لوگ ایسے تھے جو کہ غیر جانبدار تھے اور جن کی تخلیقات دونوں مجلوں کی زینت بنتی تھیں۔

''اوراق'' میں جب فتح محمد ملک کا مضمون ''فیض کی دو آوازیں'' شائع ہوا تو اس پر شدید ردعمل سامنے آیا اور اس عمل کو رقابت کا نام دیا گیا۔اس کے بعد تخلیق میں ستار طاہر نے یہ مسئلہ اٹھایا کہ مدیر اگر کسی کے مضمون کے بعض حصے حذف کر دے تو اس کی یہ حرکت کیا کہلائے گی؟ اس سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد کی مثال پیش کی گئی کہ انھوں نے علی عباس جلال پوری کا متنازعہ مضمون جو کہ علامہ اقبال پر تھا من وعن چھاپ دیا اور ساتھ ہی فٹ نوٹس میں یہ تحریر کر دیا گیا تھا کہ مضمون نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔لیکن ستار طاہر کی یہ مثال ٹھیک نہیں کیونکہ فتح محمد ملک اور علی عباس جلال پوری کا موازنہ درست نہیں۔جب علی عباس جلال پوری کا مضمون شائع ہوا تو اس وقت وہ عالمانہ مقام پر تھے جبکہ فتح محمد ملک کی حیثیت ایک طالب علم کی سی تھی۔ڈاکٹر انور سدید مدیر کی حیثیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مزید دریافت کیا گیا ہے کہ مدیر اگر مضمون کے بعض حصے حذف کر کے چھاپ دے تو اس حرکت یا عمل کو کیا نام دیا جائے گا؟ جواباً عرض ہے کہ اسے مدیر کا حقِ ادارت شمار کیا جائے گا۔کوئی مدیر اپنے پرچے کو لکھنے والوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑتا۔نہ اپنے صفحات پر غلط ملط نظریات کی تبلیغ کی اجازت دے سکتا ہے؟ اور نئے لکھنے والوں کے مضامین پر تو مدیر کو

بہت زیادہ اور سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔۱۹۶۶ء میں فتح محمد ملک ابھی اتنے بڑے فنکار نہیں تھے کہ ان سے اختلاف کو مدیر فٹ نوٹس میں پیش کرتا۔ دوسرا کوئی مبتدی نقاد اپنے ممدوح کو خدا سے بڑا فن کار ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو تو اس کی درستی ضروری ہو جاتی ہے۔۶۵

دن بہ دن یہ دشنامی مہم ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔اس کی زد میں نہ صرف ڈاکٹر وزیر آغا آئے بلکہ ان کی نسبت سے دیگر بہت سے لوگ جن میں ڈاکٹر انور سدید سرفہرست تھے۔ قاسمی گروپ کی طرف سے برسائے گئے تیروں کی زد میں آگئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا بہت منکسر المزاج اور دھیمی شخصیت کے مالک تھے۔ کبھی انھوں نے کسی مخالف کی مخالفت کا جواب نہیں دیا۔وہ گالی گلوچ کے جواب میں بھی صرف مسکرانے پر اتفاق کرتے لیکن اس لڑائی نے ان کو اعصابی طور پر کمزور کر دیا تھا اور ان کے اندر گھٹن پیدا کر دی۔ جس کے نتیجے میں وہ بیمار پڑ گئے۔لیکن ان کی بیماری جسمانی سے زیادہ نفسیاتی نوعیت کی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے روز کے ان جھگڑوں سے تنگ آکر ''اوراق'' کو بند کر دیا۔وزیر آغا کے خلاف ایک نظم لکھ کر پھیلا دی گئی۔اس میں ان کی ذات پر بہت کیچڑ اچھالا گیا اور ان کی کردار کشی کی گئی۔''اوراق'' کی دوسالہ بندش کا زمانہ اگرچہ ان پر باراں گراں تھا لیکن اس کے باوجود قلم سے ان کا رشتہ قائم رہا۔انھوں نے تمام حالات پر غور وفکر کیا اپنے ساتھ وقت گزار اور اس نتیجے پر پہنچے کے ''اوراق'' کو بند نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ مخالفین کو تو مسئلہ خود وزیر آغا کی ذات سے ہے۔لہٰذا دو سال کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا نے دوبارہ سے اوراق کا اجرا کر دیا۔

ڈاکٹر انور سدید ''اوراق'' کی بندش اور دوبارہ اجرا کے بارے میں لکھتے ہیں:

آپ کو یاد ہو گا کہ اوراق کے اجراء کے بعد ایک مخصوص طبقے نے وزیر آغا صاحب کو ادب سے دلبرداشتہ کر کے ادبی دنیا سے بھگانے کے لیے غلاظت کے کئی ٹوکرے چوراہے میں ڈال دیئے تھے۔ کمیونسٹ طریقہ واردات کے مطابق ان کے خلاف ننگی گالیوں سے بھرپور ایک نظم تقسیم کی گئی۔ آغا صاحب اس کے تعفن سے اتنے اثر انداز ہوئے کہ ''اوراق'' بند کر دیا۔ یہ صریحاً غنڈہ گردی تھی اور جس مرکزی شخصیت سے موسوم تھی

اس نے نہ تردید کی، نہ اس بے ادبی پر معذرت کی، حقیقت حال روشن ہوئی تو آغا صاحب نے اس غنڈہ گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اوراق پھر جاری کر دیا اس کے اجرا کے ساتھ ہی دشنامی مہم ان کے مخالفین نے پھر شروع کر دی۔٦٦

ڈاکٹر وزیر آغا نہ صرف ڈاکٹر انور سدید کے ادبی مرشد تھے بلکہ ادبی مرشد ہونے کے علاوہ وہ ان کے استاد بھی تھے۔وزیر آغا کی زیر نگرانی ہی انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مقالہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' لکھ کر حاصل کی۔لہٰذا ان دنوں کا رشتہ استاد اور شاگرد کا بھی تھا۔یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے استاد کی شان میں گستاخی نہیں سن سکتے تھے۔

جب بھی کوئی وزیر آغا کے خلاف بیان بازی کرتا تو وزیر آغا اس کے جواب میں زیادہ تر چپ ہی رہتے اور اس کو نظر انداز کر جاتے لیکن اس کے برعکس ڈاکٹر انور سدید راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو کہ دوستی اور دشمنی نبھانا خوب جانتے ہیں۔جو کہ دوستوں کے لیے جان دینا اور لینا جانتے ہیں۔یہی وجہ تھی کہ جب کبھی احمد ندیم قاسمی ان کے گروپ میں سے کوئی ڈاکٹر وزیر آغا کی ذات پر حملہ کرتا تو ڈاکٹر انور سدید اس کو جواب دینا لازمی سمجھتے تھے۔ ظفر اقبال کا کالم ''اخبارِ پاکستان'' میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے وزیر آغا پر تنقید کی اور کہا کہ اس میں دیانت کا فقدان ہے اور یہ بات لوگوں میں عام ہو چکی ہے۔ ان کی اس رائے پر ڈاکٹر انور سدید نے اپنے استاد محترم کا دفاع کرتے ہوئے لکھا۔:

سلام مسنون، اخبار پاکستان (۱۳ جنوری) میں آپ کا کالم بلاناغہ جس میں آپ نے ڈاکٹر وزیر آغا کے انٹرویو مطبوعہ نوائے وقت (۷ جنوری) اور اسی پرچے میں روزن دیوار سے کے ایک اقتباس کو موضوع بحث بنایا ہے۔ میں نے بغور پڑھا متعدد مقامات پر شدید اختلاف بھی پیدا ہوا اور اس بات پر تو شدید حیرت ہوئی کہ آپ جیسے وکیل پیشہ ادیب اور شاعر جو عدالت میں دودھ کو پانی سے اور پانی کو دودھ سے الگ کرنے کا فن جانتے ہیں، لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید میں نہ صرف دیانت کا فقدان ہے بلکہ یہ بات زبان زد خاص وعام ہو چکی ہے۔ میں نے پہلے سوچا کہ کالم کی بات کالم تک ہی رہنی چاہیے اور اسے اہمیت نہ دینا ہی بہتر ہے لیکن بعد میں جب متعدد دوستوں

نے آپ کی اس رائے پر حیرت کا اظہار کیا اور مجھے احساس ہوا کہ آپ کی رائے کا اعتبار ختم ہو رہا ہے تو یہ عریضہ لکھنا ضروری سمجھنا۔ ۶۷

ڈاکٹر انور سدید نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ باوجود اس کے کہ احمد ندیم قاسمی ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف بات کرتے رہتے تھے اور ان کی کردار کشی سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کیا کبھی ان کی برائی نہیں کی۔ وہ ان کو ہمیشہ محترم کہا کرتے تھے لیکن ان کی اس بات کو بھی تعصب قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں احمد ندیم قاسمی اس تعصب اور لڑائی کو کبھی ختم نہیں کریں گے اور نہ صرف خود یہ لڑائی لڑیں گے بلکہ اپنے ساتھیوں کے ذریعے بھی وزیر آغا کی ذات کو ہدف تنقید بناتے رہیں گے۔

ظفر اقبال کو مزید مخاطب کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

وزیر آغا نے احمد ندیم قاسمی کو محترم کہا تو آپ نے اسے بھی ان کا تعصب قرار دیا۔ واقعہ یہ ہے وزیر آغا نے قاسمی صاحب کو ہمیشہ محترم لکھا ہے، محترم سمجھا ہے اور ان کی عالم پایہ شاعری اور افسانہ نگاری کے خلاف کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ حالانکہ ندیم کبھی انہیں معاف نہیں کرتے بلکہ اپنے ہاکی برداروں سے بھی ان کی اہانت کراتے ہیں اور یہ سلسلہ گزشتہ ربع صدی سے جاری ہے، آیندہ ایک ہزار سال تک قاسمی صاحب اسے ضرور جاری رکھیں گے۔ ۶۸

آگے مزید ڈاکٹر انور سدید احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں کہ منٹو نے بھی کبھی ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں دی اور نہ ہی بھارت کے نقاد ان کو افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

ندیم صاحب نے اپنی شاعری کی طرح افسانہ نگاری کا بھی بہت ڈھنڈورہ پٹوایا ہے۔ آپ بھی اس ڈھنڈورے کے شور سے متاثر نظر آتے ہیں۔ منٹو نے اپنی زندگی میں ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں اچھی رائے نہیں دی تھی۔ کیا آپ منٹو کو متعصب قرار دیں گے؟ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک ضخیم کتاب اردو افسانے پر مرتب کی ہے۔ اس میں قاسمی صاحب پر ایک مضمون بھی نہیں ہے۔ میں نے باقر مہدی سے

پوچھا کہ بھارت کے نقاد افسانہ نگاروں کی کھٹارنی میں قاسمی صاحب کا نام کیوں شامل نہیں کرتے؟ وہ میری بات سن کر کھل کھلا کر ہنسے۔ ان کے قہقہے میں مجھے اپنی ہی نہیں ایک عظیم پاکستانی افسانہ نگار کی بھی سبکی محسوس ہوئی۔ کیا آپ انہیں بھی متعصب قرار دیں گے۔ آپ نے انہیں فیض سے بڑا شاعر مان لیا ہے تو افسانے میں اب منٹو سے بڑا افسانہ نگار بھی تسلیم کر لیں۔۶۹

وزیر آغا صاحب کا دفاع کرتے کرتے خود ڈاکٹر انور سدید کی ذات پر بھی حملے ہونے لگے۔ ان کو طنز اور دشنام کو نشانہ بنایا جانے لگا۔ کبھی یہ وار احمد ندیم قاسمی صاحب کی طرف سے تو کبھی عطاالحق قاسمی کی طرف سے ہوتا۔ ڈاکٹر انور سدید بھی اپنے مکتوبات اور کالموں میں ان کا جواب دیتے یوں ادب، ادب سے زیادہ سیاست کا رنگ اختیار کر گیا۔ دونوں گروپوں کے مابین جھڑپیں چلتی رہتی تھیں اور رنجشیں اس قدر شدت اختیار کر گئی تھیں۔ اس قدر شدت کہ یہ لڑائی جھگڑے، ادب کی حد سے نقل کر ذاتیت میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمایا کہ ''انور سدید کا نام لینے سے میری زبان پلید ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں یہ جملہ خود احمد ندیم قاسمی کے لیے بہت چھوٹا تھا لیکن وہ کبھی اس پر نادم نہ ہوئے حالانکہ خود ان کی ذات پر ہونے والی تنقید کو وہ برداشت نہ کرتے اور وہ سخت نالاں ہو جاتے اور یہ چاہتے کہ دوسرا ان سے معافی مانگے۔ قاسمی صاحب کہ اس طرز عمل کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

گزشتہ شمارے میں اکبر کاظمی صاحب نے بڑے ادبا کے منہ سے ارادتاً یا غیر ارادتاً نکل جانے والے دشنامی جملوں کو موضوع بحث بنایا اور فرمایا تھا کہ محترم جناب احمد ندیم قاسمی کا یہ جملہ کہ ''انور سدید کا نام لینے سے میری زبان پلید ہو جاتی ہے'' اقبال ساجد کے اس شعر سے زیادہ تلخ نہیں تھا:

نئے زمانے میں ان کا جواز کچھ بھی نہیں
فراق وفیض وندیم وفراز کچھ بھی نہیں

خدا جانے کاظمی صاحب نے اس بات کو کس طرح نظر انداز کیا کہ پہلا جملہ خالصتاً دشنام ہے۔ جبکہ اقبال ساجد کا شعر تنقید ہے۔ اگرچہ یہ تلخ تنقید ہے۔ وہ اقبال ساجد سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ معذرت کر کے بات ختم کر دیتا۔ لیکن معذرت حاصل کرنے کا حق مجھے نہیں دیتے اور میرے دفاعی عمل کو بھی موردِ تنقید بناتے ہیں۔ ۷۰

نہ صرف احمد ندیم قاسمی خود بلکہ ان کے دوست عطا الحق قاسمی صاحب کی طرف سے بھی انور سدید پر گولہ باری ہوتی رہی۔ انھوں نے کہا کہ انور سدید کو مرے ہوئے پندرہ سال ہو گئے۔ عطا الحق قاسمی کے اس بیان کے بعد ادبی حلقے میں ردعمل بھی ظاہر ہوا اور مختلف ادیبوں نے عطا الحق قاسمی صاحب کے اس رویے پر دکھ کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں اگر یہ ردعمل نہ آتا تو یہ سمجھنے کہ بدی کے خلاف آواز اٹھانے والے ختم ہو گئے ہیں اور اس سے پورے ادبی معاشرے کا کردار مجروح ہوتا۔ مختلف ادیبوں کے ردعمل پر طمانیت کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا:

حضرت مولانا احمد ندیم قاسمی کے خلف رشید جناب عطا الحق قاسمی کے ارشاد پر کہ انور سدید کو مرے ہوئے کم از کم پندرہ برس ہو گئے ہیں۔ پرویز بزمی اور غلام ثقلین نقوی نے اپنا ردعمل پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ برخود غلط ادیبوں کا احتساب ضروری ہے وہ خاموشی اختیار کرتے تو میں سمجھتا کہ اب بدی اور برائی کے خلاف آواز اٹھانے والوں سے معاشرہ خالی ہو گیا ہے۔ جب قاسمی صاحب نے اس ناچیز کا نام لینے سے اپنی زبان پلید ہو جانے کا اظہار کیا تو ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا تھا کہ ایک ادیب کی کج خیالی سے صرف ادیب کا کردار مجروح نہیں ہوتا بلکہ پورا معاشرہ منہدم ہو جاتا ہے۔ ۷۱

ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی اس لڑائی نے ادبی دنیا کو کیا دیا اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ ادب میں وزیر آغا کی پہچان انشائیہ اور تنقید جب کہ احمد ندیم قاسمی کی پہچان

افسانہ اور شاعری تھی۔ دونوں کے میدان یکسر مختلف تھے۔ اگر یہ لڑائی نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے دونوں گروپ زیادہ اچھے طریقے سے ادب کی خدمت بجالا سکتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید کی ذات سے جتنا فائدہ ڈاکٹر وزیر آغا کو پہنچا اور کسی کو نہ ہوا۔ اگر چہ ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات کی فہرست بلاشبہ اب بھی بہت طویل ہے لیکن اگر وہ اس گروپ بندی کا حصہ نہ ہوتے تو شاید زیادہ کام کر پاتے۔ لیکن ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اگرچہ ڈاکٹر وزیر آغا کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود جب بھی وہ کسی سے ملتے تو محض اس کی علمی وادبی وابستگی دیکھتے تھے۔ اس بات کو مد نظر رکھتے کہ اس شخص میں ادب کی محبت کتنی ہے۔ وہ کس قدر ادب کی ترقی میں حصہ ڈال سکتا ہے۔

اگر کبھی کوئی قاسمی گروپ کا ادیب ان کے پاس جاتا تو اس سے ملتے ہوئے وہ بہت خوشی محسوس کرتے۔ اس کی ادبی خدمات کو سہراتے اور آگے بڑھنے میں اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ حق بات کرتے اور حق پر ڈٹے رہتے تھے۔ انھوں نے نظریات کی جنگ لڑی مگر یوں کہ اپنی ذات اور انا کو پس پشت رکھتے ہوئے۔ ڈاکٹر انور سدید ہمیشہ یہ کوشش کرتے کہ یہ نام نہاد جنگ ختم ہو جائے اور قاسمی صاحب اور وزیر آغا صاحب کے درمیان میں تمام رنجشیں ختم ہو جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے بہت سی عملی کوششیں بھی کیں جو کہ بارآور ثابت نہ ہو سکیں۔ تخلیق میں مجید اختر نے دونوں گروہوں کو ناراضی ختم کرنے کا مشورہ دیا اس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> لاس اینجلس سے مجید اختر صاحب نے بڑا صائب مشورہ دیا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا گروپ اور قاسمی گروپ کے لوگوں کے معاندانہ خطوط اور مضامین کی اشاعت ''نرد بان'' اور ''معاصر'' کے لیے مخصوص رہنے دیں لیکن انہیں شاید علم نہیں کہ میں نے وزیر آغا صاحب اور جناب احمد ندیم قاسمی کی ''آویزش'' ختم کرنے کے لیے دونوں کو اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی تھی۔ اس پر متعدد اخبارات میں کالم بھی لکھے گئے، لیکن قاسمی صاحب نے نہ میری دعوت قبول کی اور نہ میرے خط کا جواب دیا۔ میری تجویز ہے کہ

مجید اختر صاحب ان دونوں ارباب ادب کو لاس اینجلس بلائیں اور جب تک آپس میں صلح نہ کرا لیں واپس نہ آنے دیں۔۷۲

باوجود کوششوں کہ دونوں گروپوں میں کبھی مصالحت نہ ہوئی۔ڈاکٹر انور سدید کے لہجے میں مایوسی کی شدت دکھائی دی اور انھوں نے تمام صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس گروہ بندی سے وہ شدید مشکلات کا شکار ہیں۔جناب احمد ندیم قاسمی اور ان کے شاگرد انور سدید کے لیے دن بہ دن مشکلات میں اضافے کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید اس صورتحال میں طنزیہ لہجے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اب ۶۵ برس میں زندگی کی بہت سی حرکتیں حقیر اور بے شمار چیزیں بے بضاعت نظر آنے لگی ہیں۔حریف گالیاں بھی دیں تو یوں لگتا ہے جیسے اپنے گناہ جھڑ رہے ہیں اور جس سبکسار ہو رہا ہے۔۷۳

ایک اور مکتوب میں مزید لکھتے ہیں:

میں گزشتہ ۲۵ برس سے ادبی، سماجی، اقتصادی، اشاعتی اور نشریاتی ناکہ بندی کا شکار بنایا گیا ہوں۔اقتصادی ناکہ بندی تو میرے لیے شاید اہم نہ ہو لیکن سماجی ناکہ بندی مجھے ہرگز گوارا نہیں۔میں معمر قذافی نہیں ہوں کہ اکڑ جاؤں میں صدام حسین بھی نہیں ہوں کہ گولیوں کی بوچھاڑ کو دعوت دوں۔میں ادب کی واحد سپر پاور کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ ہوں۔قبل اس کے کہ سپر پاور کہ بمبار گولہ باری کرنے لگیں۔۷۴

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا مطالعہ کرنے پر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ادب ڈاکٹر انور سدید کا عشق ہے۔جس نے ان کی روح تک کو منور کر رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مکتوبات میں زیادہ تر ادب اور اس سے متعلقہ موضوعات ملتے ہیں۔اگر بات ڈاکٹر انور سدید کی ذات کی کی جائے تو ان کے مکتوبات میں بہت کم اس کا ذکر ملتا ہے۔ان کے مکتوبات ایک ایسی کھڑکی کی مانند ہیں جن کا ایک حصہ ان کے داخل میں اور دوسرا حصہ ان کے خارج میں کھلتا ہے۔ان کے مکتوبات ایک ایسا آئینہ ہیں جن کے عقب سے ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت کا خوبصورت عکس دیکھنے میں آتا ہے۔انسان اس دنیا میں تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔اس کی زندگی کی ڈور دیگر

بہت سے رشتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ان میں ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی اور بچے سب شامل ہیں۔اگرچہ ہر رشتہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور زندگی کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہے لیکن ماں کا رشتہ سب رشتوں سے مقدم ہوتا ہے۔کیونکہ ماں کی ہستی زندگی میں ایک ایسی چھاؤں کی مانند ہے ہے جو کہ بچوں کے غموں کے سائے سے محفوظ رکھتی ہے اور خود مشکلات سہہ کر بچوں کی خوشی کے لیے کوشاں رہتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید بھی اپنی ماں سے بے تحاشہ پیار کرتے تھے اور جب کبھی ماں کا ذکر ہو تو آبدیدہ ہو جاتے۔الحمرا کے ایڈیٹر کی والدہ کی بیماری کا پتہ چلا تو اس پر اپنی ماں کا ذکر لبوں پر آگیا اور ایک مکتوب میں لکھا:

> برادرم انور محمود خالد صاحب نے ٹیلی فون پر آپ کی والدہ محترمہ کی اچانک علالت کی خبر پر آپ کے امریکہ جانے کی اطلاع دی۔اس وقت سے ان کی صحت عاملہ کے لیے دعا کر رہا ہوں۔میرے والد گرامی کی وفات کے بعد میری ماں بیس برس تک زندہ رہیں۔ان کا وجود بے لوث دعاؤں کا سرچشمہ تھا۔ان کی دعائیں مشکلات کو آسان کرتی تھیں۔کامیابیوں کی راہ ہموار ہوتی جاتی تھی۔اب وہ وفات پا گئی ہیں تو محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کی دعاؤں کا سرچشمہ قائم رہے۔میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کا وجود گرامی الحمرا کے لیے بھی چھتر چھاؤں ہے۔الحمرا کے سب قاری ان کی دعاؤں کا فیض اٹھا رہے ہیں۔۷۵

ماں چاہے اپنی ہو یا دوسروں کی اس کی موجودگی اور اس کا وجود خدا کی طرف سے نعمت سے کم نہیں ہوتا۔اس لیے دوسروں کی ماں کو بھی عزت دیں اور اس سے اس کے بدلے میں دعائیں لے لیں۔ماں کے ذکر پر جذباتی ہونا فطری عمل ہے۔خصوصاً اس انسان کے لیے جس کی ماں اس دنیا میں موجود نہ ہو۔کیونکہ ماں کی موجودگی اور اس کی دعائیں بہت سی مشکلات میں ڈھال کا کام کرتی ہیں۔ماں کے رشتے کے ساتھ ساتھ بھائی کا رشتہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔جو کہ مشکلات میں آپ کا سہارا ہوتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید تخلیق کے نام اپنے ایک مکتوب میں اپنے بھائی کی وفات کی خبر دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ ادب سے محبت کا جذبہ ان کو ان کے بھائی کی طرف

سے ہی ملا۔ ذاتی اطلاعات اور ذاتی ذکر ان کے مکتوبات میں بہت کم ملتا ہے۔ ایک مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں:

> ا۔ میرے بڑے بھائی میاں معراج الدین ۷۲ برس کی عمر میں سرگودھا میں انتقال کر گئے۔ میں نے ادب کا ذوق انہیں سے حاصل کیا تھا۔ ان کی مغفرت کے لیے دعا کی درخواست ہے۔
>
> ۲۔ میری نئی کتاب "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" اکادمی ادبیات پاکستان سے چھپ گئی ہے۔ فی الحال مجھے اس کی ایک جلد موصول ہوئی ہے۔۷۶

ڈاکٹر انور سدید کی ادب سے والہانہ محبت کا ثبوت یہ تھا کہ وہ تقریباً تمام ادبی مجلوں سے منسلک تھے اور باقاعدگی سے ان کو اپنے مقالات وغیرہ لکھا کرتے تھے اور اس کے ساتھ تجزیاتی مکتوبات بھی ارسال کیا کرتے تھے۔ اگر کبھی ان میں تاخیر ہو جاتی تو یہ بات ان کے لیے باعث ندامت ہوتی۔ لیکن تاخیر کا مقصد بھی ادب ہی ہوتا تھا۔

"ادبی رسائل کی تاریخ" ڈاکٹر انور سدید کی تحقیقی کتاب ہے جو کہ انھوں نے اکادمی ادبیات پاکستان کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں آغاز صحافت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اور ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک تمام صحافتی تاریخ لکھی گئی۔ لہٰذا اتنے بڑے تخلیقی کام کے لیے بہت زیادہ محنت درکار تھی جو ڈاکٹر انور سدید کو تن تنہا سر انجام دینی پڑی۔ اپنے ایک مکتوب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سب سے پہلے تو میں اپنی ندامت کا اظہار کرتا ہوں کہ اس دفعہ بہ تعجیل خط نہ لکھ سکا۔ دلی یاترا کی قسط بھی ارسال نہ کر سکا: "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"
>
> اور آپ سے کیا پردہ مجھے اکادمی ادبیات پاکستان نے "ادبی رسائل کی تاریخ" لکھنے پر مامور کیا تھا۔ اس اہم موضوع پر کام کروانے کا خیال اکادمی کو سوجھا لیکن قرعہ فال میرے نام ڈالا گیا تو مجھے خود حیرت ہوئی۔ تاریخ

لکھنے کی مدت صرف چھ ماہ متعین کی گئی۔مواد کی فراہمی کا کام بھی میرے سپرد ہے۔بعد میں مدت میں تو کچھ اضافہ ہوا۔لیکن فراہمی مواد میں کوئی کوئی معاونت نہیں کی گئی۔چنانچہ گزشتہ تمام عرصہ اس کام کی تکمیل میں صرف ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ کام بھی محبت کی محنت سے سرانجام دیا۔کتاب چھپ کر آئے گی تو آپ یقینا مجھے میرے کام کی داد دیں گے۔کتاب کے اس منصوبے کے باعث میں آپ کو خط نہ لکھ سکا۔۷۷

جہاں ڈاکٹر انور سدید کی عملی زندگی کا تعلق ہے تو وہ پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے۔۱۹۷۰ء میں وہ محکمہ انہار میں بھرتی ہوئے اور جتنا عرصہ وہ اس شعبے کے ساتھ منسلک رہے پوری محنت اور ایمانداری سے کام کیا۔ ساٹھ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۸۹ء میں وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔اسی سال اللہ تعالیٰ نے ان کو دیگر بہت سی خوشیوں سے نوازا۔ان میں پوتے کی پیدائش، نقوش ایوارڈ، ادبی مجلہ اوراق کے معاون مدیر اور دو کتابوں کی اشاعت شامل تھی۔لہٰذا ۱۹۸۹ء کا سال ڈاکٹر انور سدید کی زندگی میں کامیابیوں کا سال تھا اور ان کامیابیوں نے ان کے اندر تک مسرور کر ڈالا تھا۔ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایک شکر یہ مجھ پر سب سے پہلے واجب تھا۔یہ آخر میں ادا کرتا ہوں۔آپ نے اس ناچیز کی ساٹھویں سالگرہ پر تخلیق میں چند صفحات مخصوص کرتے ہوئے مجھے زیر بار احسان کیا ہے۔یہ سال میرے لیے خوش بختیوں کا سال ہے۔پہلے ملازمت سے باعزت ریٹائرمنٹ ہوئی۔اس کے ساتھ ۱۹۱۶ء روپے ماہانہ پنشن مقرر کی گئی۔پھر سیر کا موقع ملا۔مقبرہ اورنگ زیب دیکھا۔مزار رابعہ درانی پر حاضری دی۔اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے میں قدم رکھنے کے لیے پوتا عطا کیا۔کل جاوید طفیل صاحب بتا رہے تھے کہ پانچ مصنفین کے متفقہ فیصلے سے میرے مقالے ''اردو میں حج کے سفرناموں کی روایت'' کو ۱۹۸۸ء کا نقوش ایوارڈ دیا گیا ہے۔وزیر آغا صاحب نے مجھے اوراق میں اپنا معاون مدیر بنا لیا ہے۔ایک سفر سعادت درپیش ہے۔دو تازہ کتابیں چھپی ہیں۔میں ان سب پر خدا کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔اس نے اس ناچیز پر عنایات کی بارش کر دی ہے۔۷۸

ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید ہر حال میں خدا کا شکر بجا لانے والے اس کے فرماں بردار بندے تھے اور ان کی اسی شکرگزار طبیعت کی بدولت مالک کائنات نے اپنے انعامات واکرام کی بارش ان پر کر رکھی تھی۔

ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات بہت وسیع ہیں جن کا دائرہ کار ادب کے ہر شعبے پر محیط ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات کو نہ صرف پاکستان بلکہ ہمسایہ ملک بھارت میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس بات کا ثبوت ان پر لکھا جانے والا پی ایچ ڈی کا وہ مقالہ ہے جو کہ بھارت میں ڈاکٹر سلطان احمد نے ''انور سدید کی ادبی خدمات'' کے موضوع پر لکھا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے قبل بھی بھارت میں بہت سے پاکستانی ادبا کی خدمات پر مقالہ جات لکھے گئے ہیں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا، قتیل شفائی اور محمد طفیل وغیرہ شامل ہیں۔لیکن ان تمام لوگوں نے اس کام پر فخر کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ان کی ذات میں عاجزی موجود تھی اور یہ ہی رویہ ڈاکٹر انور سدید کے ہاں دیکھنے کو ملا کیونکہ بڑا ادیب کبھی بھی اپنی پبلسٹی خود نہیں کرتا بلکہ اس کا کام خود بول کر اس کو متعارف کرواتا ہے اور یہ ہی اچھے ادیب کی نشانی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں ڈاکٹر سلیم اختر کا ذکر کرتے ہیں کہ ان پر لکھے جانے والے پی ایچ ڈی کے مقالے کی انھوں نے خوب تشہیر کی لیکن بعد ازاں اس مقالے کو ناقص قرار دیا گیا۔

ڈاکٹر انور سدید اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تخلیق" کے صفحہ دس پر ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کے مقالہ کے عین نیچے آپ نے ڈاکٹر سلطان احمد کو ''انور سدید کی ادبی خدمات'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے کی خبر بہت نمایاں شائع کی ہے۔اب اس سے سلیم اختر صاحب جو نتیجہ نکالیں، اس کی ذمہ داری آپ پر ہے۔یہ خبر اطلاع کی حد تک تو بڑی دل خوش کن ہے کہ جیسے وطن میں کوئی نہیں پہچانتا، اس کی پذیرائی وطن سے باہر کی گئی۔لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسی پاکستانی ادیب کی بھارت میں پذیرائی کیوں؟ کیا اس کے پس منظر میں بھی کوئی سیاست ہے اور کیا انور سدید نے جو اتفاق سے میں خود ہوں اتنی ادبی خدمات انجام دے دی ہیں کہ اس پر پی ایچ ڈی کی سطح پر تجزیہ کیا جائے؟ اور مقالہ لکھا

جائے؟ اس سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا، قتیل شفائی، شفیق الرحمن اور محمد طفیل پر جب ایک نہیں متعدد مقالے لکھے گئے تھے تو ان میں سے کسی نے اس پر فخر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن بعد میں جب ڈاکٹر سلیم اختر پر اس سطح کا امتحانی نوعیت کا مقالہ لکھا گیا تو انھوں نے افراط سے خبریں چھپوائیں اور بے تحاشہ شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس مقالے پر حیدر آباد کے ایک رسالے میں صرف ایک تبصرے نے غبارے سے ہوا نکال دی اور اس مقالے کو ناقص قرار دیا گیا۔ حالانکہ اس میں ڈاکٹر سلیم اختر کی علمی معاونت بھی سامنے آچکی ہے۔۷۹

ڈاکٹر انور سدید اس بات کے خلاف تھے کہ زندہ ادیبوں پر مقالے لکھے جائیں کیونکہ ایسے مقالے میں ادب کی پسند وناپسند داخل ہو جاتی ہے وہ اپنی مرضی کی چیزیں لکھواتا ہے اور جو بات اس کے خلاف جا رہی ہو سکالر بھی اس کو لکھتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے مقالات کچھ زیادہ اچھے نہیں سمجھے جاتے اور غیر معیاری قرار پاتے ہیں اور اگر کوئی طالب علم کی زندہ ادیب پر تحقیق کرے بھی تو اس کو چاہے کہ وہ پوری غیر جانبداری کے ساتھ کام کرے اور حق سچ کو لوگوں تک لائے کیونکہ یہ ہی ایک محقق کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اس پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ذاتی طور پر میں زندہ ادیبوں پر ایم اے تک کا مقالہ لکھوانا بھی پسند نہیں کرتا۔ زندہ ادیب تاثرات اور تعصبات سے آزاد نہیں ہوتا۔ اس کے تحقیقی تجزیے میں بہت کچھ درآمدی مال گھس جاتا ہے اور متعدد نتائج مشکوک ہوتے ہیں۔ مجھے طمانیت ہے کہ ڈاکٹر سلطان احمد سے میری کبھی خط وکتابت نہیں رہی۔ ان کے داخلی نگران ڈاکٹر عبدالواسع صاحب سے بھی میرا ذاتی تعارف نہیں ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس مقالے کے ممتحنوں میں ڈاکٹر جعفر رضا (الہ آباد یونیورسٹی) اور ڈاکٹر اصغر عباس (علی گڑھ یونیورسٹی) شامل تھے۔ میں ان کا شناسا ادب کے ایک دور افتادہ قاری کی حیثیت سے ہوں۔۸۰

ڈاکٹر انور سدید اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کا کوئی ذاتی تعلق ڈاکٹر سلطان احمد اور نہ ہی ان کے نگران ڈاکٹر عبدالواسع سے رہا۔اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جو مقالہ ان پر لکھا گیا ان میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔آج کل بھارت اور پاکستان کی جامعات میں پہلے سے زیادہ تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر طالب علموں کی تعداد پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔لیکن کیا وجہ ہے کہ کام کا معیار گرتا جا رہا ہے جتنے بھی تحقیقی مقالات سامنے آتے ہیں ان میں بہت کم مقالات تحقیق کی شرائط پر پورا اترتے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اب محنت کی عادت کم ہوتی جا رہی ہے۔تعلیم کا مقصد تحقیقی لگن اور جستجو نہیں بلکہ ڈگری کا حصول ہے۔یہی وجہ ہے کہ جیسے بھی ہو تحقیقی مقالہ لکھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں معیار ناپید ہوتا ہے۔پاکستان اور بھارت کی جامعات میں تحقیقی کام کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> بھارت میں اس قسم کا کام ذاتی تعلقات اور روابط کے وسیلے سے ہوتا ہے اور بالعموم غیر معیاری قرار پاتا ہے۔یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ بھارت میں پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ داغ پر لکھا گیا۔دوسرے مقالہ نگار نے امیر مینائی کو مشق ستم بنایا۔داغ کے اشعار نکال کے میر کے لکھ دیئے۔ دونوں کو ڈگری مل گئی۔لطیفہ یہ ہوا کہ دونوں کے ممتحن آل احمد سرور اور سید احتشام حسین تھے۔پاکستان میں بھی اس قسم کا الزام عائد کیا جا رہا ہے کہ بھارت کے مقالے کو معمولی ردوبدل سے پیش کر کے ڈگری لے لی گئی۔۸۱

ہمارے ہاں تحقیقی کام کا غیر معیاری ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں محنت سے جی چرانا، علم کی کمی، راہنمائی کا نہ ہونا اور مادیت پرستی وغیرہ شامل ہیں۔لیکن ان تمام وجوہات کے ساتھ ساتھ سرقہ بھی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔سرقہ سے مراد کسی دوسرے ادیب کا لکھا ہوا اپنے کام میں معمولی ردوبدل اور بغیر حوالے کے شامل کرنا ہے یہ شعوری واردات ہے اور اس کا تعلق ادب کی اخلاقیات سے ہے۔ ہمارے ہاں سرقہ نہ صرف طالب علموں کے مقالات میں پایا جاتا ہے بلکہ اس قسم کی بہت سی غیر اخلاقی حرکتیں بڑے بڑے ادیبوں کی تصانیف میں بھی ملتی ہیں۔اس

قسم کی غیر اخلاقی حرکت کسی اچھے ادیب کو زیب نہیں دیتی۔ سرقہ کی نشاندہی وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے۔ کچھ لکھنے والے اس حد تک سرقہ کرتے ہیں کہ دوسرے ادیبوں کی تصانیف سے پورے کے پورے باب نقل کر لیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں لکھتے ہیں:

> جناب طاہر نقوی، بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر صاحب اور محمد ابراہیم خلیل نے ''محفل احباب'' میں ''سرقے'' کا سوال اٹھایا ہے اور بقول ان کے انھوں نے سرقہ شدہ افسانوں کا الزام ثابت کرنے کے لیے ثبوت بھی فراہم کیے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ جن ادیبوں کو الزام کی زد میں لیا گیا ہے۔ وہ آپ کو اپنا بیان دفاع بھیجیں گے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ دوچار سال بعد اس نوع کی بحث سطح پر ابھر آتی ہے تو شدت سے بدمزا کر دیتی ہے... کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تحقیق کے مجلہ ''جریدہ'' نے ایک ''سرقہ نمبر'' بھی شائع کیا تھا۔ جس میں کئی پردہ نشینوں کو طلب شہرت میں ''سرقے'' کا مرتکب قرار دیا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''اردو ادب میں طنز ومزاح'' کے ایک باب سے تونسوی نے پورا باب سرقہ کر لیا تھا۔ اس باب سے نیاز فتح کا نام حذف کر کے اپنے ممدوح مزاح نگار کا نام لکھ ڈالا جو ان دنوں ملتان میں ڈپٹی کمشنر تھے اور تونسوی کو ان سے کوئی کام تھا۔ جس کے لیے وہ قبیح حرکت کر ڈالی۔ اس سرقے کو بعد میں محترمہ فرحت نواز نے بھی اپنے ایک مضمون میں نشان زد کیا تھا۔ ۸۲

جب بھی دوران تحقیق کسی کی کتاب سے کوئی ایک سطر بھی لی جائے تو اس کا حوالہ دینا ادیب پر فرض ہے۔ بصورت دیگر اس کا ایسا کرنا سرقہ کے ضمن میں آئے گا اور یہ ادبی اخلاقیات کے خلاف ہے۔

جسم اور روح کا تعلق عارضی ہے۔ روح کے قسم سے جدا ہونے کا نام موت ہے گویا کہا جا سکتا ہے کہ جسم اور روح کی آشنائی کا نام زندگی ہے اور زندگی عارضی ہے۔ چاہے چند دنوں کی ہو یا چند سالوں کی۔ روح ایک ایسا پرندہ ہے جو ہمارے جسم میں قید ہے اور جوں ہی اس پرندے کو

قید سے رہائی ملتی ہے وہ اپنی دنیا کی طرف لوٹنے کو بے تاب ہو جاتا ہے۔ پھر اس پرندے اور پنجرے کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور پرندہ اپنی منزل پالیتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکاتیب میں زندگی اور موت کا فلسفہ ملتا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی دھوکہ اور فریب ہے جو کہ ہمیں اپنے آپ میں مگن اور گم رکھتا ہے۔ ہم اس میں کھو کر اپنا مقصد زندگی بھول جاتے ہیں۔ زندگی کی رعنائیاں ہمیں دھوکے کی زندگی میں قید کر لیتی ہیں۔ لیکن ہوش ہمیں تب آتا ہے جب سانسوں کے ڈور کمزور پڑنے لگتی ہے اور موت کا وقت قریب سے قریب تر آتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے زندگی کی ۸۶ بہاریں دیکھیں۔ ہر انسان جب وہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اس کے لیے زندگی مشکل ہونے لگتی ہے۔ مختلف طرح کی بیماریاں اس پر حملہ آور ہوتی ہیں اور وہ خود کو صف وناتواں محسوس کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید زندگی اور موت کے رشتے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جب صحت پر علالت غالب آجائے تو معمولات حیات کی رکاب علالت کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور میں بے بس ہو جاتا ہوں۔ ایک دن اس بے بسی میں مجھے مولانا حامد علی خان کی غزل کا یہ شعر یاد آیا اور اس نے بڑا سکون دیا۔
>
> غافل! اس دو روزہ ہستی پر عبث نازاں نہ ہو
>
> زندگی ہے، آج آنے اور کل جانے کا نام
>
> اسی زمین میں مجھ پر یہ شعر اترا:
>
> سانس لینا ہے فریب زندگی کھانے کا نام
>
> موت ہے انور حیات دائمی پانے کا نام
>
> اور اسی کے ساتھ یہ احساس جاگا کہ حیات دائمی پانے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ کتنے سانسوں کی مہلت باقی ہے اور میں کتنا فریب زندگی کھا سکتا ہوں۔ ۸۳

ڈاکٹر انور سدید سانس لینے کو فریب زندگی کا نام دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک زندگی انسان کو دھوکے میں رکھتی ہے اور اس کو اس کی اصل منزل جو کہ موت ہے اس سے دور رکھتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید طویل زندگی ملنے پر خدا کے شکرگزار ہیں کہ اس نے ان کو اتنی طویل زندگی دی اور ان کے دامن کو برائیوں سے بچا رکھا۔انسان اگر اس زندگی میں اپنے دامن کو گناہ آلودہ ہونے سے بچا لے تو یہ ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اس موضوع پر لکھتے ہیں:

> اس احساس نے ہی مجھے اپنے رب کریم کے سامنے سربسجود کر دیا اور شکرانے کے طور پر یہ الفاظ زبان پر آگئے:
>
> اب فکر نہیں مجھ کو کیا جسم کی حالت ہے
>
> آٹھ عشروں میں دنیا کے سب ذائقے ہیں چکھے
>
> آفات زمانہ کی یورش ہے مگر انور
>
> بہرحال میں خوش ہوں جس حال میں رب رکھے
>
> یہ قطعہ شاید تحدیت نعمت کا آئینہ دار ہے اور اطمینان یہ ہے کہ میں نے عمر عزیز کے ۸۴ برس اپنی مرضی کے مطابق گزار لیے ہیں۔نیک نازمی حاصل نہیں ہوئی تو کوئی بدنامی بھی دامن کو آلودہ نہیں کر سکی اور اللہ کا احسان ہے کہ اس نے لمبی عمر عطا کی۔دکھ یہ ہے کہ جن دوستوں کے ساتھ میں نے زندگی کے ماہ وسال گزارے، ان میں سے اکثر اس دنیا سے پہلے رخصت ہو گئے۔۸۴

یہ مکتوب ظاہر کرتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید ہر حال میں شکرگزار تھے۔اپنے مالک کے وہ اپنے رب کی رضا میں راضی رہنے والے شخص تھے۔وہ بڑھاپے میں جن بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے ان کو بھی رب تعالیٰ کی طرف سے تحفہ تصور کرتے تھے۔کیونکہ ان کے خیال میں زندگی کے ۸۳ برس تندرستی کے اگر مالک کی عطا تھی تو بیماری عذاب کس طرح ہو سکتی ہے۔وہ نالہ دل کے نام ایک مکتوب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نادم ہوں کہ آپ کو بروقت رسید نہیں بھیج سکا۔ البتہ اطمینان ہے کہ آپ سے ٹیلی پر ملاقات ہو گئی تھی اور میں نے اپنی اس علالت کا ذکر کر دیا تھا جو بڑھاپے میں تحفے کے طور پر اللہ میاں عطا کرتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی ۸۰ واں سال عبور کر لیا ہے تو دائیں ٹانگ اور ریڑھ کی ہڈی میں خلا پیدا ہو جانے کی وجہ سے درد پیدا ہوا اور اب ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق اس درد سے مفاہمت کر کے زندگی کے مبینہ دن پورے کر رہا ہوں اور گزشتہ چار سال سے قید مسکن میں ہوں۔ اور سچ یہ ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق ۸۳ برس گزار لینا بھی معجزہ نظر آتا ہے۔ میں اسے عنایت ربی شمار کرتا ہوں۔۸۵

ڈاکٹر انور سدید نالہ دل کے نام ایک اور مکتوب میں اپنی بیماری کا تذکرہ کرتے ہیں کہ بڑھاپے نے ان کا سارا ادم خم ختم کر دیا ہے ان کے اعصاب کمزور ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ان کو دکھ اپنی تنہائی کا ہے کیونکہ جن دوستوں کے ساتھ انھوں نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا جو ان کے دکھ سکھ میں شریک تھے اور جن کی وجہ سے ان کی زندگی میں رنگینی تھی وہ سب اب ان سے دور عالم بالا میں جاچکے تھے اور ڈاکٹر انور سدید اس دنیا میں تنہا رہ گئے تھے۔ لیکن اس تنہائی اور اس قدر تکلیف میں بھی ان کا ایک رشتہ اور دوست ان کا قلم ان کے ساتھ تھا جو کہ ان کو ادب کی دنیا سے وابستہ رکھنے کا ایک ذریعہ تھا۔

قلم و قرطاس اور دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دوسری طرف حالت یہ ہے کہ ضعیفی کے عوارض نے مغلوب کر رکھا ہے۔ چار دسمبر ۲۰۱۳ء کو میں نے عیسوی تقویم کے مطابق ۸۶ ویں برس میں اور ہجری تقویم کے مطابق ۸۸ ویں سال میں قدم رکھا۔ اب اعصاب کمزور اور قویٰ مضمحل ہیں۔ اپنے ارادوں کی شکستگی کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے اتنی لمبی عمر دی جو میں نے اپنی مرضی کے مطابق گزاری اور اللہ نے اپنے بے پایاں انعامات سے نوازا۔ میری سب سے بڑی دولت میرے مشفق ومہربان دوست ہیں جن میں سرفہرست ڈاکٹر وزیر آغا

ہیں، وہی مجھے ادب میں واپس لائے اور ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ اردو ادب کی تحریکیں لکھا۔انھوں نے ہی میرا ادب میرا ریاض مکمل کرایا۔غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر وحید قریشی، افگر سرحدی، غلام الثقلین نقوی، عبدالرشید اشک، سجاد نقوی، عصمت علیگ، انور گوئندی، جوہر نظامی سب خالق حقیقی سے جا ملے۔میں تو اس دنیا میں تنہا رہ گیا۔اب اکلاپے کا عذاب برداشت کر رہا ہوں۔ تاہم غنیمت ہے کہ قلم وقرطاس سے رشتہ قائم ہے۔۸۶

بڑھاپے میں موسم کی شدت چاہے وہ شدید گرمی ہو یا سردی انسان کے کاموں اور اس کے معمولات پر ضرورت سے زیادہ اثر ہوتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید بڑھاپے کی عمر میں جب ناتوانی کا شکار ہو گئے تو موسم ان کے اور ان کے عشق یعنی ادب کے درمیان رقیب کا کام کرنے لگا۔شدید سردی میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی اور لکھنے پڑھنے کا معمول متاثر ہوتا۔

ڈاکٹر انور سدید کی عادت بن گئی تھی کہ وہ آفتاب کی روشنی میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے کیونکہ ان کی بڑھتی عمر ان کی بصارت میں بھی کمی کا باعث بن گئی تھی۔لہٰذا رات کو لکھنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔دن کو بھی سورج سردی کے موسم میں بادلوں میں چھپ جاتا اور سرد ہوائیں ان کے اور ان کے کام کے درمیان حائل ہو جاتیں اور کام نہ کرنے کا دکھ اور شدید ذہنی کرب ان کے چہرے پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

ایک دفعہ وہ ایسی ہی صورت حال کے باعث الحمرا کو مضامین ارسال نہ کر سکے اور اس پر نہایت شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے الحمرا کے نام مکتوب میں لکھا:

ٹیلی فون پر آپ کی زبان سے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ فروری کا شمارہ معینہ وقت پر شائع ہو گا۔اس اطلاع نے مجھے شرمندگی سے دوچار کر دیا۔وجہ یہ کہ میں آپ کو تاحال مضامین پیش نہیں کر سکا تھا۔میرے جسمانی اعصاب کو کچھ توضعیفی نے مضمل کر رکھا تھا، مزید ستم موسم نے ڈھایا۔میں لکھنے پڑھنے کا کام آفتاب کی روشنی میں اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھ کر کرتا ہوں جو زمہریری ہواؤں کی زد میں تھی اور تاریک بادلوں کی وجہ سے روشنی کم

تھی۔ چنانچہ لکھنے کی میز پر بیٹھنا ممکن نہ رہا اور لکھنے پڑھنے کا کام ملتوی ہوتا رہا۔ سالنامہ ملا تو مجھے اپنی کوتاہی کا شدید احساس ہوا۔ اتفاق سے آج موسم کچھ سازگار ہے۔ سرد ہوائیں رک گئی ہیں اور دھوپ بھی نکل آئی ہے۔ معمول کی تعمیل ممکن ہو گئی ہے۔۸۷

انسانی زندگی فانی ہے۔ ہر انسان ایک معین مدت کے لیے اس دنیا میں پتا ہے جو کام اس کے ذمے ہوتے ان کو کرنے کے بعد وہ اس دنیا سے ایک دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے۔ ایک دنیا سے دوسری دنیا تک کا سفر موت کہلاتا ہے۔ اس دنیا میں حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک ان گنت لوگ آئے اپنا مقررہ وقت یہاں گزارا اور چلے گئے۔ تاہم کچھ لوگ جانے کے بعد بھی ہم لوگوں کے درمیان زندہ ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم جیسے عام لوگوں سے بہت بہتر انداز میں زندہ ہیں۔ اگرچہ وہ لوگ دنیا کے سامنے نہیں منوں مٹی اوڑھ کر سو گئے ہیں لیکن ان کے کارنامے ان کے کام آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ایسے ادیب جنھوں نے سچے دل سے ادب کی خدمت کی وہ ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔ ان کو کبھی فراموش نہیں کیا جاتا۔ ان کا کام ان کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور ان کو ہمیشہ کی زندگی عطا کرتا ہے۔ غالب، ولی، میر، آتش، اقبال، سرسید اور دیگر بہت سے ادیب آج بھی اپنے کام کی بدولت زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں موت ادیب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اپنے ایک مکتوب میں وہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اہم بات یہ ہے کہ انسان فانی ہے۔ لیکن اس کی تخلیقات فانی نہیں۔ یہ نظر سے اوجھل ہو سکتی ہیں لیکن زمانے کی گود میں محفوظ رہتی ہیں۔ اور کبھی نہ کبھی دریافت بھی کر لی جاتی ہیں۔ اس طرح تخلیق کار کی نشاۃ ثانیہ برپا کر دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مجید امجد کی مثال دی جاتی ہے۔ جن کی زندگی کے آخری ایام ساہیوال کے شہر میں بسر ہوئے جو بڑا ادبی مرکز نہیں۔ ان کی شاعری کی خوشبو ان کی وفات کے بعد پھیلی اور دیوار چمن عبور کر گئی۔ ایک اور درخشاں مثال جاسوسی ناول نگار ابن صفی کی سامنے آئی ہے۔۸۸

ڈاکٹر انور سدید دعا کرتے تھے کہ موت ان کو چلتے پھرتے آئے۔ان کو کسی دوسرے کا محتاج نہ ہونا پڑے کیونکہ محتاجی سب سے بڑا عذاب ہے اور اس عذاب کو سہنا بہت مشکل کام ہے۔اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> میں اپنی معینہ اور اوسط عمر گزار چکا ہوں اور اب بونس پر زندہ ہوں جو کرم فرماؤں کی دعا سے رب کریم مجھے عطا کر رہا ہے۔میں ان سب کرم فرماؤں کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کرتا ہوں۔مجھے مزید عمر کی قطعاً خواہش نہیں لیکن یہ آرزو ضرور ہے کہ ڈاکٹر صفدر حسین، ڈاکٹر محمد صادق اور رحمن مذنب جیسی موت نصیب ہو جو چند لمحے پہلے ساز حیات پر نغمہ ریز تھے لیکن اگلے ہی لمحے سارے بے آواز ہو گیا اور ڈاکٹروں نے تصدیق کر دی کہ "وفات پا گئے ہیں۔"۸۹

(ب)ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا فنی جائزہ:

جب فنی جائزے کی بات کی جائے تو اس سے مراد ہے کہ کوئی بھی فن پارہ اپنی فنی نزاکتوں پر کس حد تک پورا اترتا ہے جو شرائط وضوابط اس کے لیے مختص کیے گئے ہیں وہ کس حد تک ان سے انصاف کر پاتا ہے۔ہر صنف ادب چاہے وہ نظم سے تعلق رکھتی ہو یا نثری اصناف میں سے ہو اس کی اپنی حدود وقیود ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر اکثر ڈرامے کی فکری اور فنی مباحث کی بات کی جائے تو اس میں پلاٹ (موضوع یا کہانی کا مواد) کہانی کا مرکزی خیال، آغاز، کردار، مکالمہ، تسلسل، کشمکش، تجسس، تصادم، نقطہ عروج اور انجام وغیرہ شامل ہے۔ان اجزا میں سے اگر ایک بھی کمزور یا غائب ہو تو ڈرامہ مکمل شکل اختیار نہیں کر سکتا۔اس لیے ہر چیز کو اپنی جگہ مکمل ہونا چاہیے تاکہ ڈرامہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

تمام اصناف ڈرامہ نگاری کی طرح مکتوب نگاری کے بھی اپنے کچھ فکری وفنی مباحث ہیں۔اس کی بھی کچھ فنی نزاکتیں ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔جدید تحقیق یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان نے ہر دور میں اپنے جذبات واحساسات کی ترسیل کو اہم جانا ہے اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ان طریقوں میں سے ایک مکتوب نگاری بھی ہے۔

مکتوب نگاری میں یہ بات سب سے اہم ہے کہ کوئی بھی مکتوب تب کامیاب ہو گا جب وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو۔اس مقصد کے حصول میں جس کے لیے وہ لکھا گیا ہے زبان آسان اور سادہ ہو تاکہ پڑھنے والوں کو دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔لفظوں کے چناؤ میں احتیاط سے کام لیا جائے۔لفظ موثر اور دل نشین ہو تاکہ بات دل سے نکلے اور دل میں اثر کرے۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا مطالعہ کیا جائے تو فنی حوالے سے اس میں اہم ترین چیز اسلوبیاتی مطالعہ ہو گا۔اسلوب سے مراد ہے کہ کوئی بھی ادیب اپنی تحریر کو کیسے لکھتا ہے۔دراصل یہ ''کیسے'' ہی اسلوب ہے اور یہی اسلوب ایک ادیب کو دوسرے سے منفرد اور ممتاز بناتا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں شخصیت کا دوسرا نام اسلوب ہے۔پروفیسر رشید احمد صدیقی اردو کا بنیادی اسلوب میں اسلوب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مبصروں نے اچھی نثر کی خصوصیات یہ بتائی ہیں کہ اس کا دربست منطقیانہ ہو اور براہ راست وبے کاست ہو جتنے اور جو الفاظ آتے ہوں اور جتنے اور جو الفاظ آئے ہوں وہی اور اتنے ہی معنی ہوں نہ کم نہ بیش، ٹھنڈے دل سے سارے نشیب وفراز پر نظر رکھی گئی ہو۔ذاتی ردعمل سے پاک ہو، جامد نہ ہو، محترک اور بے ساختہ ہو۔شعر وشاعری کی مانند نہ ہو جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدوجز کی مانند ذہن کبھی آگے بڑھ جاتا ہے کبھی پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ نظم میں توازن کا عار اسالیب کی تکرار پر ہوتا ہے۔نثر میں اسالیب کے تنوع پر نظم میں الفاظ سے جذبات کو ابھارنے کا کام لیا جاتا ہے۔نثر میں ان کا مقصد مطالب کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے۔نثرمیں جذبات کی گنجائش سطح سے نیچے ہو سکتی ہے لیکن ان کو فکر سلیم کی گرفت سے باہر نہ ہونے دینا چاہیے۔۹۰

اگرچہ اس میں رشید احمد صدیقی نے اردو نثر کے بنیادی اسلوب کو متعین کرنے کی کوشش حتی المقدور کی ہے۔تاہم ہر صنف کا اپنا اسلوب جداگانہ اور منفرد ہوتا ہے۔ناول کا اسلوب افسانے سے جدا ہو گا اس طرح ڈرامے اور انشائیہ کے اسلوب میں بھی فرق ہو گا۔

مکتوب نگاری بھی اپنا منفرد اور جداگانہ اسلوب رکھتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوباتی اسلوب کی بات کی جائے تو ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔زبان روا اور شستہ ہے۔بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے گویا کہ دریا رواں دواں ہے۔ان مکتوبات میں ہر طرح کے جذبات دیکھنے کو ملتے ہیں۔کہیں خوشی تو کہیں غم، کہیں نفرت تو کہیں محبت، کہیں طنز کے نشتر تو کہیں مزاح اور کہیں تعریف وتوصیف۔غرضیکہ اندازِ تحریر جدا اور منفرد ہے۔ ایک مکتوب میں ڈاکٹر انور سدید بہت خوبصورت انداز میں آج کے ادیبوں کے دوہرے معیار کا شکوہ کرتے ہیں اور یوں شکوہ کرتے ہیں کہ اس کو پڑھ کر غصہ نہیں آتا اگرچہ طنز کی کاٹ موجود ہے لیکن وہ اس قدر زہریلی نہیں کہ اگلے شخص کو مغلوب کر کے رکھ دے۔اظہر جاوید صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اظہر جاوید صاحب واقعہ یہ ہے کہ آج کا ادیب نہ سرسید ہے اور نہ حالی، اسے مصلح قوم ہونے کا دعویٰ تو بالکل نہیں کرنا چاہیے وہ غزلیں نظمیں اور افسانے لکھے۔اسی میں آج کے ادیب کی دنیاوی بھلائی ہے اور اس عمل سے ہی وہ اپنے کھیت کو بہتر پانی دے سکتا ہے۔ ادیب جب مصلح بننے کی کوشش کرتا ہے تو لوگ اس کے قول وفعل میں تضادات تلاشنے لگتے ہیں اور کہیں نہ کہیں کردار کی کجی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔غالب کتنا اچھا آدمی تھا کہ نہ سرسید بنا نہ حالی۔ آج کا ادیب کیا غالب کی اس روایت پر عمل نہیں کر سکتا؟ یعنی اپنے عوامی چہرے کو رنگ وروغن سے سجانے کے بجائے اس طرح پیش کرے کہ اس کے اندر کے داغوں پر پیار آنے لگے۔ اس کے گناہوں پر نثار ہونے کو جی چاہے اور وہ اپنی شاعری میں سچا بھی نظر آئے۔۹۱

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں عام بول چال کا انداز پایا جاتا ہے۔دوسرے شخص کو یوں مخاطب کرتے ہیں جیسے وہ ان کے پاس ان کے سامنے بیٹھا ہو۔یوں فاصلے سمٹ جاتے ہیں اور دوری کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔اپنے ایک مکتوب میں بہت معصومانہ انداز میں اظہر جاوید کو مخاطب

کرتے ہیں اور ان کے دوست عطا الحق قاسمی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے سب کو یہ خبر دی کہ انور سدید پندرہ سال قبل وفات پا چکا تھا۔

اس اندازِ تحریر میں جو بات سب سے زیادہ توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ دوسری دنیا یعنی عالم بالا سے یہ مکتوب لکھ رہے ہیں اور ان کے پڑوس میں مرزا اسد اللہ خان غالب بھی رہتے ہیں۔اس انداز تحریر میں طنز کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا مزاح کا انداز بھی پایا جاتا ہے جو کہ قاری کو زیر لب تبسم پر مجبور کرتا ہے۔عطا الحق قاسمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سب سے پہلے مجھے مائی ڈیئر اظہر جاوید کے مخلص دوست عطا الحق قاسمی کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انھوں نے خبر دی کہ میں پندرہ برس قبل وفات پا گیا تھا۔اس اطلاع سے مجھے اپنے یوم وفات کی کئی باتیں یاد آگئیں ہیں اور ایک خودوفاتیہ تحریر میں آگیا۔یہ اس تحریر کے ساتھ منسلک ہے۔آپ اور آپ کے قارئین پڑھیں گے تو میری وفات کا لطف اٹھائیں گے۔میں یہ عریضہ بھی عقبیٰ سے لکھ رہا ہوں۔مرزا اسد اللہ خان غالب سلام لکھواتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ ۶ فروری کے ''پاکستان'' میں کالم نگار ظفر اقبال نے جس عطا الحق قاسمی کی ''زباں کاری'' کا ذکر کیا ہے۔وہ کون حضرت ہیں۔کیا یہ داعی دین اسلام مولانا بہا الحق قاسمی کے خلف رشید ہیں اور اگر ہیں تو کیا اس ترکیب کے معنی عمل میں آکر تبدیل ہو چکے ہیں۔۹۲

ڈاکٹر انور سدید کے اسلوب میں جہاں روانی اور سادگی پائی جاتی ہے وہیں اس میں الفاظ اور زبان کی خوبصورتی بھی خاصے کی چیزیں ہیں جو کہ قاری کو متوجہ کرتی ہے اور سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔احمد ندیم تونسوی کے افسانے کی تعریف کرتے ہیں اور اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ قاری افسانے کو پڑھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔خوب صورت زبان کا انداز ملاحظہ ہو:

> احمد ندیم تونسوی کا ''ایکیٹی'' میں نے دلچسپی سے پڑھا۔یہ اثر آفریں افسانہ ہے۔بالخصوص وہ مقام جہاں قلم کی نوک آہستہ آہستہ واحد متکلم کے سینے کی بائیں طرف کی پسلیوں کے درمیان کھال چیرتی ہوئی اس کے دل کی

جانب بڑھتی چلی جاتی ہے۔عنوان کے لیے اگر اردو کا متبادل تلاش کر لیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔۹۳

اپنے ایک اور مکتوب میں جو کہ نالہ دل کے نام ہے اس میں الفاظ کی خوبصورتی بھی متاثر کیے بنا نہیں رہ سکتی۔''نالہ دل'' کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔اس کے مضامین کی تعریف کرتے ہیں اور اس کے اختصار کو اس کی بہت بڑی خوبی گردانتے ہیں۔اختصار کو جب ''شریفانہ ضخامت'' کہتے ہیں تو تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔''نالہ دل'' کی خوبیوں کے یوں معترف ہوتے ہیں:

''نالہ دل'' کا جولائی ۲۰۱۲ء کا شمارہ مل گیا ہے۔اس کرم کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔نالہ دل کی خوبی یہ ہے کہ یہ زیادہ ضخیم نہیں ہوتا اور اس کی شریفانہ ضخامت قاری کو موقع فراہم کرتی ہے کہ اس کے مضامین ایک ہی نشست میں آنکھوں سے پڑھ کر دل میں اتار لے۔۹۴

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں ایک اور بڑی خوبی مکالمہ سازی ہے۔عام بول چال کا انداز پایا جاتا ہے۔تنہائی محفل کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔مکتوب الیہ ان کے ساتھ شریک گفتگو محسوس ہوتا ہے۔ان کی تحریر زبانی گفتگو کی قائم مقام بن جاتی ہے۔یہ ہی مکالمہ نگاری ان کے ہاں بہت خوبصورت انداز میں ملتی ہے جس سے پڑھنے والا لطف کشید کرتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوب میں مکالمے کا رنگ ملاحظہ ہو:

خدا جانے شہرت بخاری صاحب نے اس بات کو لطیفہ سمجھ کر رد کر دیا ہے یا نصیحت سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔

آپ نے دوسرا سوال یہ اٹھایا ہے کہ

''ادیب کی پہچان کیا ہے؟''

نیز دریافت کیا ہے کہ

''کیا اس سوال پر کسی نے غور کیا ہے؟''

دوسروں کا تو مجھے علم نہیں۔ہاں حسن رضوی نے اس پر غور کیا ہے۔جواب کی تلاش میں یہ سوال انھوں نے ذرا ابدلی ہوئی صورت میں عبیداللہ علیم سے پوچھا تھا کہ

''شاعر کون ہوتا ہے؟''

اور عبداللہ علیم نے جواب دیا ''یہی جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے'' یعنی شاعر میر تقی میر ہوتا ہے، خواجہ میر درد ہوتا ہے، مرزا غالب ہوتا ہے۔۹۵

ایک اور مکتوب میں بھی ستار طاہر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے انٹرویو کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور وزیر آغا کے انٹرویو کو ''مشہور'' اور ''رسوا'' کا لقب ایک ہی سانس میں دیتے ہیں۔اس جانبداری کی وجہ یہ تھی کہ ستار طاہر، ڈاکٹر وزیر آغا کے مخالف گروپ یعنی احمد ندیم قاسمی کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ احمد ندیم قاسمی کے انٹرویو کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف بے بنیاد اور جھوٹی باتیں کی گئی تھیں۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں ستار طاہر صاحب کے اس رویے کا ذکر کرتے ہیں اور ستار طاہر اور احمد ندیم قاسمی کو یوں مخاطب کرتے ہوئے بات کرتے ہیں کہ گویا وہ دونوں حضرات سامنے موجود ہوں۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

ا۔وزیر آغا نے مضمون چھپوایا کہ میں گداگروں کی اولاد ہوں۔(بھئی کہاں مضمون چھپوایا؟ اس کا کوئی حوالہ؟ اس الزام کی کوئی بنیاد؟)

۲۔انہیں خوشی ہے کہ قاسمی بوڑھا آدمی ہے، جلد مر جائے گا؟ (بھئی یہ بات کہاں کہی گئی۔کس سے کہی گئی؟ اور قاسمی صاحب کو کس نے رپورٹ کی؟ اس بات کا کوئی دستاویزی ثبوت؟ اور وزیر آغا کیا خود بوڑھے نہیں ہیں؟)۹۶

مکالماتی انداز اردو مکتوب نگاری میں غالب کی ایجاد ہے اور اس کا تجربہ بہت کامیاب رہا جس نے اس صنف ادب کو چارچاند لگا دیئے۔ڈاکٹر انور سدید کے اسلوب میں تمثیلہ انداز بھی

جابجا ملتا ہے۔ اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنے کے لیے مثالوں کا سہارا لیتے ہیں جس کی مدد سے بات آسانی کے ساتھ قاری تک پہنچ جاتی ہے اور مفہوم آسان ہو جاتا ہے۔

ایک مکتوب میں جب ڈاکٹر انور سدید کو ''تخلیق'' مل جانے کی خبر ان کے ایک دوست تسلیم احمد تصور نے دی۔ اس تعریف میں سرورق کی تعریف بھی شامل تھی۔ اس پر ڈاکٹر انور سدید نے دریافت کیا کہ اندرونی اوراق اور ان میں موجود مطبوعہ مواد کے بارے میں بھی تو بتائیں۔ کیونکہ ''سرورق'' تو سٹال ویلیو بڑھانے کے لیے اور قارئین کی توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس پر ان کے دوست نے ان کو بتایا کہ تخلیق کے اندر بھی بہت کچھ ہے جو کہ پڑھنے کے لائق ہے اور اس کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

جب سرورق کا ذکر آیا تو اس کے ساتھ جڑا ایک واقعہ بھی ڈاکٹر انور سدید کو یاد آگیا اور اس کا ذکر کرنا انھوں نے ضروری خیال کیا۔ لہٰذا سرورق سے متعلق مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اب آگے بڑھنے سے پہلے سرورق ہی کے سلسلے کی سن لیجیے۔
>
> چند برس قبل ایک شاعر کی کتاب چھپی، اس نے دیوان کا ایک نسخہ دوسرے قبیلے کے شاعر کو بھیجا۔ دوسرے قبیلے کے شاعر نے کتاب کی رسید بھیجی تو احتراماً یہ بھی لکھا کہ سرورق خوبصورت چھپا ہے۔ مصنف موصوف سمجھ گئے کہ انہیں کتاب پسند نہیں آئی۔ چند برس بعد دوسرے قبیلے کے شاعر کا دیوان چھپا تو اس نے اول الذکر شاعر کو بھیجا انہیں اپنی کتاب کا حشر یاد تھا۔ انھوں نے جواباً عرض کیا کہ ''آپ کی کتاب کا سرورق بھی اچھا نہیں چھپا۔''۹۷

اپنے ایک اور مکتوب میں وہ احمد ندیم قاسمی کا تذکرہ کرتے ہیں کہ پہلے ان کا خیال تھا کہ قاسمی صاحب بہت خود دار اور غیرت مند انسان ہیں جو کسی کے سامنے سرنگوں نہیں ہو سکتے، وہ ٹوٹ سکتے ہیں لیکن جھک نہیں سکتے۔ وہ کبھی اپنے اصولوں کا سودا نہیں کریں گے۔ ان کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہنے کا موقع ملا۔ دوسرے ان کی اس شان سے جلتے تھے اور ان کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

بعد میں مجلس ترقی ادب سے انھوں نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ ان پر رقوم کی خردبرد کا الزام لگایا گیا تھا۔ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں ان کے استعفیٰ نے ان کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے تھے اور انھوں نے نوکری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا تھا۔لیکن چند روز بعد ہی وزیر اعلیٰ کے دفتر میں جا کر اپنی سرکاری نوکری میں توسیع کروا لی۔ان کے ساتھ ان کے دوست احباب بھی وزیر اعلیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ان میں عطا الحق قاسمی، منو بھائی اور عبدالقادر حسین شامل تھے۔یوں ان کے خلاف ہونے والی انکوائری بھی روک دی گئی اور اس کے ساتھ ان کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا گیا۔اس سارے واقعے کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر انور سدید مرزا غالب کی خود داری اور انا کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ دہلی کالج میں فارسی مدرس کے تقرر کے لیے سب سے پہلے مرزا غالب کو بلایا گیا۔مرزا پالکی میں سوار ہو کر صاحب سیکرٹری کے ڈیرے پر پہنچے۔صاحب کو اطلاع ہوئی۔انھوں نے فوراً بلا لیا۔مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ دستور کے موافق سیکرٹری صاحب ان کو لینے آئیں گے۔جب بہت دیر ہو گئی اور صاحب کو معلوم ہوا کہ اس سبب سے نہیں آئے، وہ خود باہر چلے آئے اور مرزا سے کہا آپ دربار گورنری میں تشریف لاویں گے تو آپ کا استقبال اسی طرح سے کیا جاوے گا۔لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔مرزا صاحب نے گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا ہے کہ اعزاز کچھ حاصل ہو نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔صاحب نے کہا ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔مرزا غالب نے کہا ”مجھ کو اس خدمت سے معاف رکھا جائے“ اور یہ کہہ کر چلے آئے۔۹۸

یہاں غالب کی مثال دے کر ڈاکٹر انور سدید نے یہ واضح کر دیا کہ بڑے لوگ نہ صرف نام کے بڑے ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنی خودداری اور اصولوں میں بھی بڑے ہوتے ہیں۔وہ رویے

پیسے کو کبھی عزت کے بدلے نہیں لیتے۔ جہاں عزت پر حرف آئے وہاں دولت ان کے لیے بے معنی سی چیز لگتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے اسلوب میں طنزیہ لہجہ بھی قابل ذکر ہے۔ طنزیہ لہجے میں وہ مخاطب تک اپنی بات یوں پہنچاتے ہیں کہ وہ طنز کے تیر سے لہو لہان ہو جاتے ہیں۔ کسی کی پرواہ کیے بغیر حقیقت کا بیان بھی ایک مشکل امر ہے۔ لیکن یہ مشکل امر ڈاکٹر انور سدید کے ہاں جابجا ملتا ہے۔ اپنے ایک مکتوب میں ادبی صورتحال پر طنز کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں دولت کے پجاری پائے جاتے ہیں۔ جن کا اوڑھنا بچھونا دولت ہے، نہ صرف عام لوگ بلکہ ہمارے ادیب بھی اس مرض کا شکار ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اس ساری صورتحال کا تجزیہ طنزیہ انداز میں کرتے ہوئے معاشرے کے کرپٹ لوگوں کو احساس دلاتے ہیں۔ وہ ادبی اداروں کے سربراہوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے ہاتھ میں حکومت کروڑوں کی گرانٹ دیتی ہے لیکن وہ کہاں جاتی ہے اس کا کسی کو کوئی اندازہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کبھی ان لوگوں کا احتساب ہوا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ خود ہر آنے والی حکومت کی طرفداری اس طرح کرنے لگتے ہیں کہ ان کے منظور نظر بن جاتے ہیں۔ لہٰذا احتساب کی روایت بن ہی نہیں پاتی۔ ڈاکٹر انور سدید طنزیہ انداز میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان اداروں نے گزشتہ کئی برس میں قومی سرمائے کے کروڑوں روپے خرچ کر ڈالنے کے باوجود "ادیب" کے لیے کیا کیا ہے؟ میرے خیال میں اس سوال کا خاطر خواہ جواب متذکرہ ادارے کے وہ سربراہ آسانی سے دے سکتے ہیں جو ان اداروں کو جمہوری روایات کے مطابق چلانے کے آرزو مند ہیں۔ لیکن آپ کا یہ برمحل سوال شاید شرمندہ جواب نہ ہو سکے، کیونکہ ہمارے ہاں فیض یاب ہونے اور فیض یاب کرنے کی مضبوط روایت تو موجود ہے لیکن سابقہ اداروں کا احتساب کرنے اور خود کو حساب کتاب کے لیے پیش کرنے کی روایت تاحال پیدا نہیں ہو سکی۔ اس لیے اظہر جاوید صاحب، اپنا سوال واپس لے لیجیے اور اس مصرعے کا ورد کیجیے:

اب اس میں نصیحت کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔وہ اظہر جاوید کو اس معاشرے کے دوہرے پن کے ساتھ نباہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ تم اس کے حالات پر پریشان مت ہو بلکہ یہ وقت بھی گزر جائے گا کیونکہ رات چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو ہوتی تو رات ہے اور اس کے بعد سحر کا آنا ایک لازمی امر ہے۔جو کہ زندگی کے اجالوں کی ضامن ہے۔یہاں بیک وقت طنز بھی ہے اور مایوسی بھی۔کیونکہ ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں اس معاشرے میں چند لوگ ہیں جو کہ تمام عہدوں پر قابض ہیں۔وہ حکومت کے منظور نظر ہیں اس لیے ان کے احتساب کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور یہ سوال اس لیے بھی نہیں اٹھایا جا سکتا کہ یہ لوگ وقت کے ساتھ اپنے آقا بدل لیتے ہیں۔طنز ومزاح ادب میں ایک بہت کاریگر ہتھیار مانا جاتا ہے۔اس کی مدد سے مشکل سے مشکل بات بھی آسانی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔اگرچہ ڈاکٹر انور سدید کوئی مزاح نگار نہ تھے اور نہ ہی ان کی شہرت کا دارومدار طنز ومزاح پر ہے مگر ان کے مکتوبات میں کہیں کہیں شگفتگی کا ہلکا تاثر بھی دیکھنے میں آتا ہے۔اس شگفتگی میں طنز کی کاٹ شامل ہو کر اس کو خاصے کی چیز بنانے میں مدد گار ثابت ہوتی ہے۔طنز ومزاح کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> تماشا ختم سے مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ہے جو سرفراز سید نے ''مشرق'' میں درج کیا ہے۔سن لیجیے یہ کچھ یوں ہے کہ اقبال اکادمی کے نئے ڈائریکٹر شہرت بخاری صاحب سرکاری کار پر سوار ہو کر دفتر تشریف لائے تو احمد فراز نے نصیحت کی ''شہرت بخاری'' یہ نوکریاں ہماریاں دھوپ چھاؤں کی طرح ہیں، اپنی سائیکل سنبھال کر رکھنا، بھلے وقت میں کام آئے گی۔
>
> خدا جانے شہرت بخاری نے اس کو لطیفہ سمجھ کر رد کر دیا ہے یا نصیحت سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔۱۰۰

اس میں مزاح کی ہلکی سی جھلک کے ساتھ طنزیہ لہجے کی پکار بھی سنائی دیتی ہے۔مزاح اور طنز کے پردے میں حقیقت آشکار کی گئی ہے اور سچ کو لوگوں تک عمدہ انداز میں پہنچایا گیا ہے۔

جب صرف مزاح کی بات کی جائے تو اس میں قہقہے کے سامان پیدا کیے جاتے ہیں لیکن جب طنز ومزاح کی بات ہو اس میں ہلکی سی مسکراہٹ بکھیری جاتی ہے لیکن اس مسکراہٹ کے

ساتھ ایک ہلکا سا پتھر بھی پھنک دیا جاتا ہے جو کہ لوگوں کے ضمیر پر جا کے لگتا ہے۔لیکن اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ یہ ایک بے رحم عمل ہے۔طنز نگار کے پیش نظر معاشرے کی بھلائی بھی ہوتی ہے۔اسی ذمہ داری کی بدولت وہ حساس اورسخت جان بھی ہوتا ہے۔وہ اس کا مقصد صرف اور صرف معاشرے کو اس ناسور کا احساس دلانا ہوتا ہے جو کہ ان کے درمیان پل رہا ہوتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں بھی طنز ومزاح کی یہی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس کے علاوہ بہت کم ہی سہی لیکن ان کے ہاں تحریف نگاری بھی پائی جاتی ہے جو کہ طنز ومزاح کی ایک بہت کامیاب اور مقبول شکل ہے تحریف کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔یہ نظم کی صورت بھی ہوتی ہے اور نثر کی صورت بھی کہا جا سکتا ہے کہ نظم یا نثر کی بگاڑی ہوئی صورت تحریف کہلاتی ہے۔تحریف کا مقصد اصلاح، طنز، تضحیک یا توہین ہو سکتا ہے۔تحریف اب صرف مزاح کی ذیلی شاخ ہی نہیں رہی بلکہ ادیبوں نے اپنی تحریروں میں اس کو اس حد تک برتا ہے کہ یہ ادب کی الگ صنف محسوس ہوتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید اپنے ایک مکتوب میں ستار طاہر کے جارحانہ رویے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> میں نے تسلیم کیا کہ فٹ نوٹس نگار صاحب بہت سے پی ایچ ڈی اوں سے زیادہ پڑھے لکھے ہیں، لیکن اب اس میں یہ ترمیم ضروری ہو گی ہے کہ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے سے خوشبو کشید نہیں کی۔بلکہ دو پیسے کا کام کیا ہے۔غلاظت جمع کی اور ٹوکرے میں ڈال کر ''تخلیق'' کے صفحات میں الٹ دی۔میں نے ان کے لیے دعا کی تھی کہ
>
> ''اللہ کرے جوشِ قلم اور زیادہ''
>
> اب مزید دعا کرتا ہوں کہ
>
> ''پختہ ہو تری دعوت دشنام زیادہ''۱۰۱

اب اس میں تحریف کی طنزیہ شکل سامنے آتی ہے۔''اللہ کرے جوش قلم اور زیادہ کو''، ''پختہ ہو تری دعوتِ دشنام زیادہ'' سے بدل دیا گیا۔ڈاکٹر انور سدید کے اسلوب میں ایک اور طرز جو کہ عام طور پر دکھائی دیتی ہے وہ سوالیہ انداز ہے۔سوالیہ اسلوب قاری کو سوچ کی نئی منازل

کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اس کے اندر تجسس ابھارتا ہے۔ بہت سے سوالات جب قاری کے ذہن کے اندر پیدا کیے جاتے ہیں تو قاری ان سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں اس کا تعلق ادب کے ساتھ مزید پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں اس پر نئے در ہوتے ہیں اور اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

تخلیق کے ایک مکتوب میں جب مارشل لاء اور ادب پر اس کے اثرات کی بات کرتے ہیں تو پڑھنے والوں کے لیے سوال پر سوال چھوڑتے جاتے ہیں تاکہ قاری خود مارشل لا اور اس کے متعلق ادیبوں کا جو رویہ تھا اس پر اپنا نقطہ نظر خود قائم کرے۔ سوالہ انداز ملاحظہ ہو:

> رہ گیا مارشل لاء کی حمایت کا سلسلہ؟ تو اس سوال کا جواب آپ سے بہتر کون جانتا ہے؟ میں تو صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ گیارہ سال تک مارشل لاء کی چھڑی قوم کے سر پر تانے رکھنے کے باوجود کیا ضیاء الحق صاحب نے ایک دفعہ بھی مارشل لاء کی حمایت کی ہے؟ اور کیا ہر لمحے جمہوریت کے گن گانے اور جزوی طور پر شورائی نظام کو عمل میں لانے کے ساتھ کیا وہ مارشل لاء کی مذمت نہیں کرتے رہے؟ اور مذمت کی بات آئی تو کیا "تادمِ تحریر" میں صدیق سالک کا مضمون "مارشل لاء" اس نظام پر گہری ضرب نہیں لگاتا رہا؟۱۰۲

کچھ مکتوبات تو ایسے بھی ہیں جن کو ختم ہی کسی سوال پر کرتے ہیں گویا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس تعلق اور رابطے کو ہمیشہ بحال اور زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سوال وجواب کے اس ذریعے سے تعلقات چلتے رہیں اور دوسروں کی خیر خبر ملتی رہے۔ تخلیق میں ایک مکتوب میں اپنی سالگرہ کا ذکر کرتے ہیں اور اظہر جاوید صاحب سے کہتے ہیں کہ آیا وہ ان کو یاد رکھیں گے اور مبارک باد دیں گے کہ نہیں۔ اظہر جاوید کے نام اپنے مکتوب کا اختتام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خدا آپ کی اور آپ کے قارئین کی عزت اور زندگی کو تحفظ دے۔ ۶۷ برس کے اختتام پر رسم دنیا موقع اور دستور کے مطابق کیا میں اپنی سخت جانی پر آپ کی مبارکباد کا انتظار کروں؟ والسلام۔۱۰۳

سوالیہ انداز ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کی اہم خوبی ہے جو کہ ان کے مکتوبات کی فنی حیثیت میں اضافے کا باعث بنی ہے۔ تجسس کا عنصر ابھارتی ہے۔ غرض یہ کہ سوالیہ طرز ان کے اسلوب کی پہچان ہے۔ مکالماتی، طنز ومزاح، تحریف اور سوالیہ انداز بیان کے علاوہ اشعار کا استعمال ان کے مکتوبات میں ملتا ہے اور اشعار نثر میں پوری روانی کے ساتھ آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ گویا وہ نثر کا حصہ ہوں۔ ان میں بے ساختگی دکھائی دیتی ہے۔ نمونے کے طور پر اقتباس ملاحظہ ہو:

> مجھے تو ''ادبی دنیا'' بھی ان دو برائیوں کے شدید حملے کی زد میں نظر آتی ہے۔ مجھے فیصح اکمل صاحب سے شرف تعارف حاصل نہیں لیکن
>
> ''ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے''۱۰۴

ایک اور جگہ یوں روانی کے ساتھ مصرعہ لاتے ہیں کہ جو وہ کہنا چاہتا ہے وہ اپنا پورا مفہوم قاری تک پہنچا دیتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جب مجلس ترقی ادب کو استعفیٰ دیتے ہیں تو ڈاکٹر انور سدید ان کے اس عمل کو سراہتے ہیں کہ انھوں نے ضمیر کا سودا کرنا گوارا نہیں کیا اور اپنی انا کو محفوظ کر لیا اور ان کا یہ عمل ان کی ذات پر لگے الزامات کو ختم کر دے گا۔ لیکن بعد میں احمد ندیم قاسمی صاحب اپنی نوکری میں توسیع کروانے وزیر اعلیٰ پنجاب کے پاس جا پہنچتے ہیں اس پر ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ذاتی طور پر مجھے افسوس یہ ہے کہ میں نے ان کی عظمت کو سربلند کرنے کے لیے ان کی شان میں جس تحریک کا آغاز کیا تھا اب وہ غیر طبعی موت مر گئی ہے۔
>
> ''وائے'' ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا۔۱۰۵

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

> فٹ نوٹس نگار صاحب کے بارے میں جو رائے عامہ ''انجمن خیال'' کے خطوط سے بنتی ہے وہ عبرت انگیز ہے اس سے انہیں مزید دشنام طرازی کے لیے ہشکار بھی مل سکتی ہے۔۔۔اس قسم کی غلاظت کی ٹوکریاں سمیٹنے کے لیے

دامن پھیلا دیا ہے اس لیے فٹ نوٹس نگار صاحب میرے آنگن کو ضرور استعمال میں لائیں۔اس غلاظت کو سمیٹ کر۔

''میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا''۱۰۶

غرض یہ کہ مکتوب نگاری میں اشعار کا استعمال اور وہ بھی اس قدر روانی کے ساتھ اس کے حسن میں چار چاند لگاتا ہے اور پڑھنے والا اس عمل سے محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔

خود کلامی کی صفت اگرچہ ڈرامہ نگاری میں بہت اہمیت کی حامل ہے اور یہ اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب کوئی شخص اپنے آپ کو غیر تصور کر لے۔لیکن ڈاکٹر انور سدید اپنے مکتوبات میں کبھی کبھار انور سدید کو بھی غیر تصور کرتے ہیں اور یوں ان کا ذکر کرتے ہیں کہ گویا کسی اور کی بات کر رہے ہوں۔

اپنے ایک مکتوب میں انور سدید کو کوستے ہوئے لکھتے ہیں:

سلام مسنون! آپ یقین کریں نہ کریں یہ انور سدید بے حد الجھا ہوا اور پریشان خیال بندہ ہے اور جب سے اس نے ایک قومی اخبار میں صحافت اختیار کی ہے اس کی مت بالکل ماری گئی ہے۔اپنی طرف سے سنبھال کر چیزیں رکھتا ہے لیکن ضرورت پڑے تو ملتی نہیں۔پھر ان کی تلاش میں بہت سا وقت ضائع کر دیتا ہے۔۱۰۷

خود کلامی کے ساتھ ساتھ کہیں ان مکتوبات میں جزئیات نگاری بھی ملتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید جو بات یا واقعہ بیان کرتے ہیں وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اس سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر جب وہ اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہیں تو چھوٹی باتوں کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔بات سے بات نکالنے کا فن ڈاکٹر انور سدید کے ہاں کمال صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے ایک مکتوب کا اقتباس ملاحظہ ہو:

اس مرتبہ فلو (Flu) نے بری طرح رگیدا۔نزلہ ناک اور آنکھوں سے بہتا رہا اور گلے پر بھی گرتا رہا۔اس پر ۱۰۰ سے ۱۰۲ درجے کا بخار۔کبھی اتر جاتا ہے، کبھی پھر اچانک جسم کو دبوچ لیتا ہے۔اگرچہ اب اس بیماری سے

افاقہ ہے لیکن ''فلو'' پسپا نہیں ہوا۔ اپنے اثرات شدید نقاہت کی صورت میں چھوڑ گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں جو الحمرا ایک ہی نشست میں پڑھنے کا عادی تھا اب قسطوں میں پڑھ رہا ہوں اور آپ کو خط بھی تاخیر سے لکھ رہا ہوں۔ معذرت ہزار بار معذرت۔۱۰۸

اس اقتباس میں سے الحمرا کو دیر سے خط لکھنے کی وضاحت کرتے ہیں اور پوری تفصیل کے ساتھ اپنی بیماری کا احوال بیان کرتے ہیں جو کہ جزئیات نگاری کی عمدہ مثال ہے۔

منظر نگاری بھی ڈاکٹر انور سدید کے ہاں ملتی ہے۔ وہ کبھی حالات کی تصویر پیش کرتے ہیں تو کبھی ماحول کی۔ منظر کے ساتھ ساتھ پس منظر بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ منظر نگاری اتنی خوبصورت ہوتی ہے کہ تمام مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں اور ہماری آنکھیں ڈاکٹر انور سدید کے دکھائے منظر دیکھنے لگتی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کی منظر نگاری کے ضمن میں ذیل کا اقتباس دیکھئے:

آج صبح پہلی ملاقات ''تخلیق'' سے ہوئی۔ صبح کی نماز کے لیے مسجد جانے کے لیے نکلا تو دروازے کے پاس حضرت ''تخلیق'' کھڑے تھے۔ میں نے شکوہ کیا کہ رات بھر دروازے پر کیوں قیام کیا۔ دستک دے کر جگایا کیوں نہیں۔ تخلیق کی خاموشی میں ہزاروں جواب تھے جو صبح کی نماز کے آخری سجدے تک مجھے اپنی طرف منعطف کرتے رہے۔ آج میں نے صبح کی سیر موقوف کر دی اور سارا وقت تخلیق کے ساتھ گزارا۔ دفتر سے چھٹی ہے اس لیے آج کا ضروری کام جو آپ کو خط لکھنا ہے، آج ہی کر رہا ہوں۔ حالانکہ اب میں آج کا کام پرسوں پر ڈالنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ کل پر اس لیے نہیں ڈالتا کہ کل پرسوں سے پہلے آجاتا ہے۔۱۰۹

اس اقتباس کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں بیک وقت منظر نگاری، جزئیات نگاری، مرقع نگاری اور مزاح کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ وہ ''تخلیق'' کو ایک انسانی روپ دیتے ہیں اور اس کے ساتھ محو گفتگو دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ وہ قاری کو زیر لب مسکراہٹ کا تحفہ بھی دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ آج کا کام پرسوں پر ڈالنے کا عادی ہوں

کل پر اس لیے نہیں ڈالتا کہ کل پرسوں سے پہلے آجاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید بات اس خوبصورت اور آسان انداز میں کرتے ہیں کہ پڑھے لکھے ہی نہیں بلکہ ان پڑھ دونوں ہی ان کی بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں۔ان کے مکتوبات میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ڈاکٹر انور سدید نہ صرف اردو کے مزاج دان تھے بلکہ انگریزی بھی ان کے لیے اجنبی نہ تھی۔ان کے مکتوبات میں بہت کم ہی سہی لیکن انگریزی الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔لیکن کمال یہ ہے کہ یہ الفاظ قاری پر گراں محسوس نہیں ہوتے۔مثال کے طور پر:

حالانکہ اس میں وزیر آغا کا ''پیٹرن'' استعمال نہیں کیا۔۱۱۰

اس ڈپلو میٹک بیان پر میں حیران نہیں ہوا۔۱۱۱

لیکن بھائی! ہم لوگ تو اپنے پبلک امیج کو ہی سنوار رہے ہیں۔۱۱۲

''پیٹرن''، ''ڈپلو میٹک'' اور ''پبلک امیج'' یہ الفاظ قاری کے لیے آسان ہے اور وہ ڈکشنری دیکھے بغیر ان کے مطالب جان سکتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں فنی حوالے سے ایک اور پہلو بہت اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مکتوبات میں جابجا محاورات اور ضرب المثال سے کام لیتے ہیں۔اور یہ اتنے دلکش انداز میں تحریر کا حصہ بناتے ہیں کہ قاری کو بوجھل محسوس نہیں ہوتے بلکہ ان کی مدد سے ڈاکٹر انور سدید کے نقطہ نظر تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔محاورات کے استعمال کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

پھر سنا کہ اکادمی کے لیے ماہ نو سفید ہاتھی ہے۔اکادمی تو ادبیات کی اشاعت کو بھی بار سمجھ رہی ہے۔۱۱۳

اداروں کا نو سو من لوہا کون کون سے چوہے کھا گئے۔۱۱۴

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

آپ جیسے ادیب اور شاعر جو عدالت میں دودھ کو پانی سے اور پانی کو دودھ سے الگ کرنے کا فن جانتے ہیں۔۱۱۵

آپ آیئے ہم ''تماشہ ختم۔پیسہ ہضم'' کہہ کر اول الذکر دو باتوں کو حافظے کی کمزور زمین میں دفن کر دیں اس مردے کو گہرا گاڑ دیں۔۱۱۶

اب ان میں ڈاکٹر انور سدید اکادمی ادبیات کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکادمی ''ماہ نو'' کی اشاعت روکنا چاہتی ہیں۔اس لیے کہ وہ اس کے اخراجات نہیں اٹھا سکتی ایسے میں وہ ''ماہ نو'' کو ''سفید ہاتھی'' قرار دیتے ہیں۔ آگے وہ ایک اور محاورہ استعمال کرتے ہیں کہ ادبی ادارے جن کو حکومت کی طرف سے گرانٹس ملتی ہیں لیکن آج تک یہ نہیں پتہ چلا کہ وہ پیسہ کہاں جاتا ہے۔اس لیے وہ کہتے ہیں کہ کون سے چوہے نو سو من لوہا کھا جاتے ہیں۔

الغرض ڈاکٹر انور سدید کی مکتوب نگاری کا موضوعاتی جائزہ لینے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے مکتوبات میں موضوعات میں وسعت ملتی ہے۔ہر طرح موضوع ان کے مکتوبات کا حصہ ہیں جن میں بالخصوص ادبی موضوعات جن میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، نظم، آزاد نظم پابند نظم، افسانہ، انشائیہ، ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ ادبی اداروں کا کردار بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کے فرائض پر بات بھی کرتے ہیں۔ادبی رسائل اور ڈائجسٹ کا تقابلی جائزہ بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ مذہب، سیاست اور تعلیم کی اہمیت اور ان میں درپیش مسائل بھی جابجا ملتے ہیں۔اس کے غلاوہ بہت سی شخصیات کا ذکر بھی ان مکتوبات میں ہے۔ایک اور پہلو جس کو بہت زیادہ ذکر ہے وہ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کی گروپنگ کا ذکر ہے۔

فنی حوالے سے بھی ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس میں مکالمہ نگاری، سوالیہ انداز، طنز ومزاح، جزئیات نگاری، قافیہ کا استعمال، منظر نگاری اور محاورات کا استعمال ملتا ہے۔

الغرض اس باب میں ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا موضوعاتی اور فنی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ان مکتوبات کا جو کہ مختلف ادبی مجلوں، تخلیق، الحمرا، انگارے، نالہ دل اور اسالیب وغیرہ میں شامل ہوتے رہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد رفیع ازہر، مربی بہ یار... ادب بہ خواندہ، مطبوعہ، سہ ماہی اسالیب، سرگودھا، شمارہ ۲۳، ستمبر تا دسمبر، ۲۰۱۶ء، ص ۳۰

۲۔ ایضاً، ص ۳۱

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۵۔۶، جلد ۱۲، دسمبر ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۱

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، خط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیر، شمار ۱۴، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۲

۵۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۶۔ انور سدید، انجمن خیال، خط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۲۰، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۸۱

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، خط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۳، اکتوبر ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۲

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، خط، مشمولہ: مکتوبات دوستاں: مشاہیر ادب کے خطوط کا مجموعہ، مرتبہ ابوالمعانی عصری، تحریک فروغ اردو، میانولی، ۱۹۸۷ء، ص ۸۵

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، خط، مطبوعہ، سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۵، اپریل۔ جون ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۳

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، حرف زر، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ انگارے، ملتان، نومبر ۲۰۰۵ء، ص ۸۷

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، حرفِ زر، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ انگارے، ملتان، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۹۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۲

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۲۔۴، جلد ۱۱، نومبر ۱۹۸۰ء، ص ۱۲۸

۱۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، خط، مطبوعہ: نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۳، اکتوبر ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۱

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، حرفِ زر، خط، مطبوعہ، ماہنامہ انگارے، مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۹۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۹۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۹۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۱

۲۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔ ۱۲، جلد ۲۰، نومبر۔ دسمبر، ۱۹۸۹ء، ص ۸۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۱

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۷۔ ۸، جلد ۷، جولاءی۔ اگست، ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۶

۲۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، حرف زر، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ انگارے

۲۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارا ۱۱۔ ۱۲، جلد ۷، ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۲۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۳۔ ۴، جلد ۲۰، مارچ۔ اپریل، ۱۹۸۹ء، ص ۹۴

۲۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، حرفِ زر، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ انگارے، ملتان، جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۹۳

۲۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۹۔ ۱۰، جلد ۲۰، ستمبر۔ اکتوبر، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۲۔ ۱۱۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۱۳

۳۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۳۔ ۴، جلد ۲۰، مارچ۔ اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۹۵

۳۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمار ۱۱۔۱۲، جلد ۱۹، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۰

۳۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۸، جلد ۲۹، اگست ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۹

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۳۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمرا، لاہور، شمارہ ۹، جلد ۱۰، ستمبر ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۳۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمرا، لاہور، شمارہ ۶۔ جلد ۱۰، جون ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۶

۳۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، حرف زرِ، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ انگارے، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۷۷

۳۹۔ ایضاً، ص ۷۷

۴۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۷، نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۶

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔۱۲۸

۴۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۲۰، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۸۲

۴۳۔ ایضاً، ص ۸۲۔۸۳

۴۴۔ ایضاً، ص ۸۳

۴۵۔ ایضاً، ص ۸۳

۴۶۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمر، لاہور، شمارہ ۷، جلد ۱۳، جولاءی ۲۰۱۳ء، ص۱۲۸

۴۷۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمر، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۱۲، اپریل ۲۰۱۲ء، ص۱۳۰

۴۸۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۲۶، اپریل ۱۹۹۵ء، ص۱۲۹

۴۹۔انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۲، جولاءی ۲۰۱۲ء، ص۱۳۶

۵۰۔انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۴، جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء، ص۱۳۳

۵۱۔انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۵، اپریل تا جون ۲۰۱۳ء، ص۱۵۴

۵۲۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۹۔۱۰، جلد ۲۰، ستمبر۔اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص۱۱۳

۵۳۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۲۶، اپریل ۱۹۹۵ء، ص۱۳۰

۵۴۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۲۔۴، جلد ۱۱، ۱۹۸۰ء، ص۱۲۸۔۱۲۹

۵۵۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۷، ۱۹۹۷ء، ص۱۲۶

۵۶۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمرا، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۱۳، اپریل ۲۰۱۳ء، ص۱۲۰

۵۷۔ایضاً، ص۱۲۱

۵۸۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمرا، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۱۲، اپریل ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۰

۵۹۔انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمار ۱۵، اپریل تا جون ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۵

۶۰۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۲۳، اپریل ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۶

۶۱۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۸، جلد ۲۹، اگست ۱۹۹۸ء، ص ۱۳۰

۶۲۔ایضاً، ص ۱۳۰۔۱۳۱

۶۳۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۱۹، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۴

۶۴۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد ۲۳، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۵

۶۵۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۰، جلد ۲۳، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۹

۶۶۔انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد، ۲۳، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۵

۶۷۔انور سدید، ڈاکٹر، ایک کھلا خط، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ بزدبان، سرگودھا، شمارہ ۳۔۴، جلد ۲، مارچ اپریل ۱۹۹۳ء، ص ۱۲

۶۸۔ایضاً، ص ۱۳

۶۹۔ایضاً، ص ۱۳

۷۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۳۔۴، جلد ۲۰، مارچ ۱۹۸۹ء، ص ۹۶

۷۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۲۶، جون ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۲

۷۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد ۲۶، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۵

۷۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد ۲۳، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۵

۷۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۸، جلد ۲۳، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۷

۷۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمرا، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۱۰، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۶

۷۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۰، جلد ۲۳، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۱

۷۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۳۔۴، جلد ۲۰، مارچ ۱۹۸۹ء، ص ۹۴

۷۸۔ ایضاً، ص ۹۷

۷۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۳۲، جون ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۰

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۸۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمراء، لاہور، شمارہ ۲، جلد ۱۳، فروری ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۷

۸۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمراء، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۱۳، جون ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۲

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۸۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۲، جولاءی ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۵

۸۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ: سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۰، جنوری۔مارچ ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۰

۸۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمرا، لاہور، شمارہ ۲، جلد ۱۳، فروری ۲۰۱۳ء، ص ۱۳۴

۸۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، محفل احباب، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمرا، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۱۳، جون ۲۰۱۳ء، ص ۱۲۳

۸۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۹۰۔ رشید احمد صدیقی، پروفیسر، اردو نثر کا بنیادی اسلوب، مشمولہ: تنقیدی مقالات، حصہ نثر، مرتبہ میرزا ادیب، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۵ء، ص ۹۰

۹۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۱۹، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۱

۹۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۲۶، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۸

۹۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، حرف زر، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ انگارے، جنوری ۲۰۰۴ء، ص ۹۴

۹۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، خطوط، مطبوعہ سہ ماہی نالہ دل، بھیرہ، شمارہ ۱۳، اکتوبر ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۱

۹۵۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۹۔۱۰، جلد ۲۰، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۲

۹۶۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۰، جلد ۲۳، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۱۸

۹۷۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۴، جلد ۲۳، اپریل ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۵

۹۸۔انور سدید، ڈاکٹر، حرف زرد، مطبوعہ ماہنامہ انگارے، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۸۷

۹۹۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۹۔۱۰، جلد ۲۰، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۱

۱۰۰۔ایضاً، ص ۱۱۱۔۱۱۲

۱۰۱۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد ۲۳، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۴

۱۰۲۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۱۹، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۰۔۱۴۱

۱۰۳۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد ۲۶، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۴

۱۰۴۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۸، جلد ۲۹، اگست ۱۹۹۸ء، ص ۱۳۱

۱۰۵۔انور سدید، حرف زر، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ انگارے، دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۸۷

۱۰۶۔انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۲، جلد ۲۳، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۱۳۶

۱۰۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۸، جلد ۱۳، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۰

۱۰۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ الحمراء، لاہور، شمارہ ۷، جلد ۱۲، جولاءی ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۱

۱۰۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۶، جلد ۳۲، جون ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۰

۱۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔ ۱۲، جلد ۲۰، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۸۴

۱۱۱۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، انمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ، تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔ ۱۲، جلد ۲۰، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۴۱

۱۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔ ۱۲، جلد ۱۹، نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۸

۱۱۴۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، ایک کھلا خط، خط، مطبوعہ: ماہنامہ نردبان، سرگودھا، شمارہ ۳۔ ۴، جلد ۲، مارچ۔ اپریل ۱۹۹۳ء، ص ۱۲

۱۱۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، خطوط، مطبوعہ: ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۹۔ ۱۰، جلد ۲۰، ستمبر اکتوبر، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۱

باب سوم

تقلید غالب اور مکتوبات انور سدید

(الف)ڈاکٹر انور سدید پیش رو غالب:

غالب دنیائے ادب کے اندر وہ نام ہے جو ہر دور میں ادیب کے لیے امام وپیشوا کا درجہ رکھتا تھا۔کم وبیش ہر شاعر، ہر نثر نگار نے اسلوب غالب کو اپنانے کی سعی کی ہے۔کسی نے غالب کی زمین کو لے کر غزل لکھ ڈالی تو کسی نے ان کے قافیہ اور ردیف کو لے کر سعی کی ہے۔لیکن ایک بات جو بنا کسی حیل وحجت کے ہر دور کا ادیب وشاعر مانتا ہے وہ یہ ہے کہ آج تک نہ کوئی غالب جیسا لکھ پایا نہ لکھ پائے گا۔وہ تمام لوگ جنھوں نے اسلوب غالب کو کسی نہ کسی طرح اپنایا ہے ان میں سے ایک اہم نام ڈاکٹر انور سدید کا ہے۔

ان کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے غالب کے پیرائے میں غالب بن کر ''غالب کے نئے خطوط ماہنامہ تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید اور عذرا اصغر کے نام لکھے ہیں۔جہاں تک اردو مکتوب نویسی کا تعلق ہے۔مرزا اسد اللہ خان غالب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپ نے مکاتیب کو ایک نئے رنگ وآہنگ سے متعارف کروا کے اردو مکتوب نگاری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ غالب سے قبل مکاتیب کا انداز وآہنگ میں عام روز مروہ انداز سے ہٹ کر بناوٹ سے بھرپور، فارسی الفاظ کی بھرمار اور عبارت میں ایک لوچ موجود تھا۔جب غالب نے مکاتیب لکھنے شروع کیے تو آپ نے اس انداز کو یکسر نظر انداز کر کے ایک نئے لہجے وآہنگ کو متعارف کروایا۔غالب نے اپنے طرز خاص کو مقبول عام کی سند دلوا کر اپنے طرز کو اردو مکاتیب نگاری کا معتبر حوالہ بنا دیا۔

غالب کے مکاتیب میں پر تکلف الفاظ کو چھوڑ کر سادہ الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔غالب کے ہاں ہمیں بے تکلفی عام ملتی ہے۔ان کے مکاتیب ان کے عہد کی روداد بھی ہیں جن کی مدد سے

اس دور کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔یہ مکاتیب اپنے عہد کی معاشرت کے بہترین عکاس بھی ہیں۔

اس باب کے جزو اول میں اس بات کو جانچنے کی کوشش کی جائے گی کہ ڈاکٹر انور سدید، غالب کے انداز کے ساتھ کس حد تک انصاف کر سکے۔وہ ان کے اسلوب کو کہاں تک لے کر چل پائے۔آیا غالب کے مکتوبات میں ملنے والا انداز انور سدید کے ہاں بھی ملتا ہے کہ نہیں۔

مکاتیب کا آغاز القاب وآداب سے کیا جاتا ہے۔غالب کو جیسے ہر دوسرے طریقے میں انفرادیت حاصل ہے یہی انفرادیت القاب وآداب کے استعمال میں بھی برقرار رہتی ہے۔انھوں نے مکتوب نگاری کا جو نیا انداز اختیار کیا اس میں رسمی القاب وآداب کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تاہم غالب نے فراق مراتب کو بہرحال ملحوظ رکھا ہے۔اس کا اندازہ مختلف مکتوب الہان کے نام موجود خطوط کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ان کے القاب وآداب میں بے تکلفی ہے مگر یہ تکلفی صرف اس حد تک ہے جس حد تک مکتوب الیہ سے ان کے رشتے اور تعلق کی نوعیت اجازت دیتی ہے۔جہاں احترام کا رشتہ ہے وہاں اس کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ایک اور بات جو ان کی انفرادیت کو ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ غالب سے قبل لمبے چوڑے القاب وآداب لائے جاتے تھے۔اگر غالب کے ہاں مختصر مگر جامع القاب ملتے ہیں اور بعض دفعہ تو بغیر کسی القاب وآداب اور تمہیدی کلمات کے ہی اپنا مدعا بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

غالب کے ہاں القاب وآداب کے مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں۔اول بے تکلفانہ انداز گفتگو اس ضمن میں نہایت مختصر القاب وآداب لائے ہیں۔ دوم بزرگ عہدیداروں اور نوابوں وغیرہ کے نام مکتوبات میں ان کی حیثیت اور مراتب کو محلوظ رکھا گیا ہے۔اب اگر ہم انور سدید کے مکتوبات میں موجود القاب وآداب پہ غور کریں تو غالب کی پیروی ڈاکٹر انور سدید کے ہاں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انور سدید نے غالب کے رنگ میں غالب بن کر اسی طرح کے القاب وآداب لائے ہیں جو مکاتیب غالب کا خاصہ ہیں۔

اب ذرا دونوں کے مکاتیب میں موجود القاب وآداب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔غالب ایک جگہ اپنے ہندو شاگرد ہرگوپال تفتہ کے نام اس کو یوں مخاطب کرتے ہیں ’’کاشانہ دل کے ماہ دو

ہفتہ"، منشی ہرگوپال تفتہ: ا۔اب جب ہم انور سدید کے ان مکاتیب پر نگاہ ڈالتے ہیں جو انھوں نے غالب کے رنگ میں لکھے ہیں تو میں اوپر بیان کردہ ہرگوپال کے نام لکھے گئے مکتوب میں موجود القاب وآداب اسی طرح استعمال ہوتا دکھائی دیتا ہے۔انور سدید لکھتے ہیں "کاشا نہ دل کے ماہ دو ہفتہ مرزا اظہر جاوید! ۲

غالب کے مکاتیب میں دیکھیں تو القاب وآداب کے ذیل میں "بھائی" کے صیغے کا انداز تخاطب بار بار اور بہت جگہوں پر ملتا ہے۔ایک جگہ اپنے شاگرد میر مہدی مجروح کے نام لکھتے ہیں "بھائی! تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔۳ایک اور جگہ میر مہدی کے نام ہی لکھتے ہیں "بھائی! ایک خط تمہارا پہلے پہنچا اور ایک خط کل آیا۔پہلے خط میں کوئی امر جواب طلب نہ تھا۔"۴

ڈاکٹر انور سدید بھی اسی انداز میں میر اظہر جاوید کو مخاطب کرتے ہیں۔بھائی! میں نہ کافر نہ مسلمان۔میرا مذہب ترک رسوم ہے۔۵ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: بھائی! داستان نگاری میں رجب علی بیگ کا معترف ہوں۔میر امن کا قدر دان ہوں۔۶

غالب مکاتیب میں اپنے شاگردوں اور دوستوں کو بے تکلف انداز میں میری جان کہہ کر بلاتے ہیں۔یہ ہی انداز ہمیں انور سدید کے "غالب کے نئے خطوط" میں بھی نظر آتا ہے۔اب دونوں کا انداز دیکھیں غالب ہرگو پال کو مخاطب کرتے ہیں تو لکھتے ہیں "میری جان! کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی، پانی ٹھنڈا ہو گیا، فصل اچھی ہو گئی۔"۷ ایک اور جگہ میر افضل علی میرن کو لکھتے ہیں: میری جان تمہارا رقعہ پہنچا۔نہ کھلا کہ میرا سرفراز حسین جے پور کیوں جاتے ہیں؟۸

اب بعینہ یہ ہی انداز انور سدید کے ہاں ملاحظہ ہو۔ایک جگہ اظہر جاوید کو مخاطب کرتے ہیں: میری جان! اظہر جاوید! ناسازی طبیعت و بے ربط اطوار، بطریق داغ، آرزوئے دیدار وآتش شرارہ بار اور ایک دریائے ناپید کنارا۔"۹

مزید آگے لکھتے ہیں "میری جان! تمہیں حق حاصل ہے کہ تم اسے جملہ معترضہ کہو پر ماجرائے حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کے آنے سے پہلے تین طرح کی خوشی مجھے حاصل ہوتی ہے۔"۱۰

مکاتیب غالب میں غالب ''صاحب'' کا صیغہ لاتے ہیں۔انور سدید کے ہاں بھی یہ صیغہ القاب وآداب کے ضمن میں دکھائی دیتا ہے۔غالب کے ہاں اس کا استعمال کچھ یوں ہوا ''صاحب! قصیدہ کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے مجھے بھی دی ہے خدا ان کو سلامت رکھے۔''۱۱ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''کیوں صاحب! اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔نہ مرزا آئے نہ منشی صاحب ہی۔''۱۲

انور سدید کے مکتوبات میں بھی صاحب کا صیغہ بہت خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔اور یہاں بھی وہ غالب کے پیش رو کے طور پر سامنے آتے ہیں۔''صاحب کئی بار دل چاہا کہ تمہیں خط لکھوں لیکن متخیر کہ کیا لکھوں اور کیوں لکھوں۔''۱۳ ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''صاحب بندہ! یہ بات یونہی سر سبیل تذکرہ قلم پر نہیں آئی۔اس کا ایک پیش منظر ہے۔''۱۴

مرزا غالب نے مکاتیب کے ضمن میں ''برخوردار'' کا صیغہ لایا ہے۔اور یہ ہی صیغہ ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں بھی جابجا استعمال ہوا ہے۔غالب اس کو یوں لکھتے ہیں ''برخوردار! دو خط آئے اور آج یکشنبہ ۱۳ نومبر کو لفافہ اخبار آیا۔''۱۵ ایک اور جگہ منشی شیونارائن کو یوں مخاطب کرتے ہیں: ''برخوردار! آج اس وقت تمہار خط مع لفافوں کے لفافے آیا۔دل خوش ہوا۔''۱۶

اب ڈاکٹرانور سدید جب رنگ غالب کی عکاسی کرتے ہیں تو لکھتے ہیں: ''برخوردار! یہ بات تو کچھ نہیں کہ خط کا جواب نہیں لکھتے۔اگر شتاب نہیں لکھتےتو خیر دیر سے لکھو۔''۱۷

یہ تو ایک نہایت مختصر سا جائزہ تھا جو ہم نے القاب وآداب کے ضمن میں لیا ہے۔اس سے واضح ہو چلا کہ ڈاکٹر انور سدید نے ''غالب کے نئے خطوط'' میں بہت حد تک انہی القاب وآداب کو برتا ہے جو کہ غالب نے استعمال کیے ہیں۔اسی طرح القاب وآداب کی جہاں تک بات ہے غالب کے نئے خطوط بہت حد تک خطوط غالب کی طرز پہ لکھے دکھائی دیتے ہیں۔

مرزا غالب کے مکتوبات کی جہاں تک بات کی جائے تو ان میں ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے القاب وآداب کے فوراً بعد بنا کسی تمہید کے اور اپنے حال احوال بتانے یا اگلے کادریافت کرنے کے بجائے اپنی بات بیان کرنے لگتےہیں۔اس سلسلے میں بھی ہم غالب کو امام قرار دے سکتے ہیں کہ انھوں نے فارسی کی اس روایت کو جو ان سے قبل موجود تھی جس میں مکتوب

نگار حال احوال دریافت کرتا اور اگلے کو اپنے حال سے آگاہ کرتا الغرض چند رسمی جملے تھے جو کہ ہر مکتوب میں ضروری خیال کیے جاتے تھے۔لیکن غالب نے اس روایت سے انحراف کیا اور ایک نیا انداز متعارف کروایا۔

مرزا غالب مختصر القاب وآداب کے بعد اپنا مدعا بیان کرنے لگتے ہیں۔ان کے مکاتیب کا رویہ روایتی مکتوب نگار سے ہٹ کر ہے۔

دوسری طرف جب ڈاکٹر انور سدید کے لکھے ہوئے "غالب کے نئے خطوط" کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ان میں ہمیں یہ ہی انداز دکھائی دیتا ہے۔غالب کی تقلید کرتے ہوئے ہمارے دور کے غالب "انور سدید" نے اسی انداز کو ان تمام مکتوبات میں برتا ہے جو غالب کا خاصا ہے۔ اب اس انداز کا جائزہ غالب کے مکتوبات میں یوں سامنے آتا ہے۔مرزا غالب "میر مہدی مجروح" کے نام ایک مکتوب میں بنا کسی تمہیدی کلمات کے یوں بات شروع کرتے ہیں:

> صاحب! دو خط تمہارے برسبیل ڈاک آئے۔کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، داڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔۱۸

اب ڈاکٹر انور سدید کا انداز ملاحظہ کیا جائے تو اس میں بھی یہ ہی نکتہ سامنے آتا ہے کہ وہ بھی مدعا ایسے ہی بیان کرتے ہیں جو کہ غالب کا خاصا ہے۔لکھتے ہیں: "یہ بات تو کچھ نہیں کہ خط کا جواب نہیں لکھتے، اگر شتاب نہیں لکھتے تو خیر دیر سے لکھو، تمہارا خط آیا۔ کلیاں نے حقہ تازہ کیا۔میں نے پہلے تمہارا خط پڑھا پھر حقے کو منہ لگایا۔"۱۹

اوپر بیان کردہ تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ غالب بنا احوال مکتوب الیہ سے اپنا مدعا بیان کرنا شروع دیتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید بھی مختصر القاب وآداب کے بعد مکتوب الیہ کو اپنی خیریت سے نہ مطلع کرتے ہیں نہ ہی مکتوب الیہ سے اس کی خیریت دریافت کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

> صاحب! عجب تماشہ ہے تمہارے کہنے سے میں نے عذرا اصغر کو خط لکھا۔وہ اوصاف گنوائے جو اوصاف حسنہ کہلاتے ہیں اور عذرا اصغر میں موجود ہیں۔۲۰

الغرض اس پہلو میں ڈاکٹر انور سدید غالب کی مکمل صورت میں پیروی کرتے ہیں اور ان ہی کے انداز کو اپناتے ہیں۔

ظرافت اور مزاح غالب کے مکتوبات کا اہم ترین حصہ ہیں۔غالب نے مزاح کے عنصر کو اپنے مکتوبات میں شامل کر کے ان کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے اور پڑھنے والوں کو شگفتہ انداز میں اپنے مکاتب میں دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔دراصل غالب نے آنسو اور قہقہوں کے درمیان زندہ رہنے کی راہ نکالی ہے۔خوشی اور غم کے درمیان جینے کی راہ وہی شخص نکال سکتا ہے جس نے اپنی اصلاح کر لی ہے اور غالب ایک ایسا ہی انسان ہے جس نے اپنی ذات کو سنوار لیا ہے اور وہ ہر جگہ ہر قسم کے حالات سے نبھا کرنے اور جینے کی طاقت رکھتا ہے۔مکتوب نگاری میں اگر غالب کا انداز دیکھا جائے تو ان کے مکتوبات میں مزاح کے پہلوؤں کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔

''غالب کے نئے خطوط'' کا مطالعہ کیا جائے تو ڈاکٹر انور سدید ظرافت اور مزاح کے عنصر کو اپنے مکتوبات میں جگہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔تقلید غالب یہاں بھی جاری وساری ہے۔

اب ہم خطوط غالب اور ''غالب کے نئے خطوط'' کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے نئے غالب نے کیسے مرزا غالب کے اس انداز سے انصاف کیا ہے۔اب ملاحظہ ہو انداز غالب۔ایک جگہ ہرگوپال تفتہ سے مخاطب ہیں:

> زین العابدین خان مرحوم میرا فرزند تھا اور اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں۔میرے پاس آرہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔خدا گواہ ہے کہ میں نے تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔تمہارے نتائج طبع، میرے معنوی پوتے ہیں۔جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے ننگے ننگے پاؤں میرے پاؤں پر رکھتے ہیں، کہیں پاؤں بڑھاتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں۔میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں میں کیوں گھبراؤں گا۔۲۱

غالب کا اجتماعی ماحول غم انگیز تھا مگر اس ماحول میں غالب نے جینے کی راہ نکالی اور اس طرح نکالی کہ انھوں نے شگفتگی اور مزاح کو اپنے مکتوبات کی بنیاد بنا ڈالا۔لال آشوب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> کیوں صاحب! ہم سے ایسے ہی خفا ہو گئے کہ ملنا بھی چھوڑا۔خیر میری تقصیر معاف کرو اور اگر ایسا ہی گناہ عظیم ہے کہ کبھی نہ بخشا جائے گا تو وہ گناہ مجھ پر ظاہر کرو تاکہ میں اپنے قصور پر اطلاع پاؤں۔۲۲

ان مثالوں سے واضح ہو چلا کہ غالب کے مکاتیب میں مزاح کے عنصر کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اس عنصر کے استعمال سے غالب نے شگفتگی پیدا کی ہے اور ان کا قاری مکتوب پڑھتے ہوئے بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔اب ذرا دیکھئے کہ ڈاکٹر انور سدید نے کس طرح اسلوب غالب کی پیروی کرتے ہوئے مزاح کے عنصر کو اپنے مکاتب میں جگہ دی ہے۔''غالب کے نئے خطوط'' سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔پہلے خط میں لکھتے ہیں:

> بھائی اردو ادب تمہارا احسان مند ہے کہ تم تخلیق کے ساتھ ساتھ تصویر بھی چھاپتے ہو اور ویران بساط ادب کو حسینانِ زر نگاہ سے جلوہ آرا کر دیتے ہیں۔جو کبھی مجھ بوڑھے کی کھوسٹ کی تصویر چھاپ دو تو لوگ بالیقین رسالہ تمہارا نذر آتش کر دیں۔۲۳

کس قدر خوب صورت پیرائے میں مزاح کی آمیزش سے ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تحریر میں خوب صورتی اور تازگی پیدا کر دی ہے۔بے ساختہ سنجیدگی کی جگہ شوخ مسکراہٹ نے لے لی ہے۔مزاح کا ایک اور خوبصورت انداز ہمارے نئے غالب کے ہاں ملاحظہ ہو:

> پر میاں تم نےاندرون جلد شیریں جمالوں، ناپید خصالوں اور راحت غزالوں کی محفل میں جوہر نظامی انورسدیداور زمان کنجاہی کھوسٹ مردوں کو کیوں لا بٹھایا۔یہ لوگ دھوکہ کرتے ہیں۔بڑھاپے میں جوانی کی تصویر چھپواتے ہیں اور بتان مغاں شیوہ میں شرکت جوانوں کی لازم تھی تو میری تصویر شامل کرتے۔۲۴

بہت ہی خوبصورت انداز بیان ہے نئے دور کے نئے غالب کا۔ شگفتہ پیرائے میں اپنی بات کرتے غالب کی یاد دلاتے۔ انور سدید مکتوب نگاری میں اپنے آپ کو منواتے ہیں اور غالب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

مکاتیب غالب کا جائزہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ غالب کے مکاتیب میں ہمیں شعر وشاعری دکھائی دیتی ہے۔ غالب بر محل اس کو لاتے ہیں اور اس کے ذریعے سے مکتوب میں ایک حسن اور خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ عہد غالب کا ماحول بھی اس طرح کا تھا کہ لوگوں کے رجحانات اشعری کی طرف زیادہ تھے اور غالب چونکہ تھے بھی اپنے عہد کے نبض شناس انسان جنھوں نے اپنے عہد کے رجحانات کو اپنی شاعری اور نثر دونوں میں سمیٹا ہے۔ امام وپیشوا اس لیے مکتوب نگاری میں اشعار اس قدر خوبصورتی سے لاتے ہیں کہ جیسے محفل میں چار چاند لگ جائیں۔ مکاتب غالب کی پیروی کرنے والے انور سدید کے ہاں بھی یہ رنگ غالب ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے بھی بر محل اشعار لا کر مکتوب کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ انور سدید نے رنگ غالب کو کس حد تک برتا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے مکتوبات سے ہو سکتا ہے۔ اب ذرا دونوں کے مکاتیب سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ غالب ''میر مہدی مجروح'' کو ایک جگہ لکھتے ہیں:

لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا تھا:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ ۲۵

ایک اور مکتوب جو غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کے نام لکھا ہے۔ اس میں بھی کس قدر خوبصورتی سے انھوں نے اپنا ہی شعر لکھا جو صورت حال کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

میں تو روز شب اس فکر میں ہوں کہ زندگی تو یوں گزاری۔ اب دیکھئے موت کیسی ہو۔

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ

مر گئے پر دیکھے دکھلائیں کیا

میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسب حال ہے۔۲۶

منشی کیشور نرائن کو تو جو مکتوب لکھے ہیں ان میں ایک جگہ پوری کی پوری غزل ہی لکھ بھیجی ہے۔ جس نے ان کے مکتوب کو بہت ہی پر لطف بنا دیا ہے اور پڑھنے والا لطف بھی لیتا ہے اور غالب کو داد بھی دیتا ہے۔ دیکھئے کیسے لکھتے ہیں،

اب میں طبع آزمائی کرتا ہوں اور جو غزل تم نے بھیجی ہے اس کو لکھتا ہوں۔ خدا کرے نو کے نو شعر یاد آجائیں:

ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ، تو کیا ہے؟

تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن

ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے؟۲۷

یہ تو ہوا غالب کا انداز اور ان کے مکاتیب سے چیدہ چیدہ مثالیں کہ کیسے انھوں نے اپنے مکاتیب میں شعر وشاعری کا بر محل استعمال سے شگفتگی پیدا کی ہے۔ ایک ایک جگہ شعر کو اس کی ضرورت کے مطابق لایا ہے کہ کہیں کچھ غیر ضروری نہیں محسوس ہوتا ہے۔ اب ہم ذرا نئے دور کو اپنے غالب کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کیسے وہ رنگ غالب کو اپناتے ہوئے شعروں کو برتا ہے۔

چند مثالیں دیکھیں:

اے بھائی! اخبار امروز سے اس کے اخراج پر میں چونکا نہیں تھا۔ دم تحریر یہ شعر زبان پر آگیا تھا:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر اگر آج لکھتا تو روئے سخن خالد احمد کی طرف ہوتا۔۲۸

ایک اور مثال دیکھیں جہاں انور سدید نے اپنے دل کی بات کس قدر خوبصورتی سے میرزا حاتم علی بیگ کی زبان سے بیان کرتے ہیں۔لکھتے ہیں:

حبیب لبیب میرزا حاتم علی بیگ میر نے میرے دل کی بات یوں کہی ہے:

اس عہد میں ہر ایک تہہ چرخ کہن لٹا

اوروں کا زرلٹا، مرا نقد سخن لٹا

عرض پرداز ہوں کہ اس دور میں مداح ناشائستہ صد ہزار آفرین اور ممدوح شائستہ سزاوار صد آفرین ہے۔۲۹

ایک اور جگہ رنگ غالب کو غالب کے نئے خطوط میں ملاحظہ فرمائیں:

تخلیق میں اصغر مہدی کا یہ شعر مجھ کو مزا دیتا ہے:

میں گنہگار ہوں، انسان ہوں، پیغمبر تو نہیں

ہاں ستم خوردہ ہوں اپنوں کا ستم گر تو نہیں

میں نے یہ بات یوں کہی تھی:

حد چاہے سزا میں عقوبت کے واسطے

آخر گناہ گار ہوں کافر تو نہیں ہوں میں۔۳۰

دونوں حضرات کے مکاتیب کو پڑھنے کے بعد اور ان میں سے چیدہ چیدہ مثالیں دینے کے بعد یہ بات بہت حد تک واضح ہو گئی کہ انور سدید کے ہاں رنگ غالب کافی حد تک دکھائی دیتا ہے۔جس انداز میں غالب نے اپنے مکاتیب میں شعر و سخن کو برتا ہے اور اس کے ذریعے شائستگی اور شگفتگی پیدا کی ہے یہی انداز غالب کے نئے خطوط میں انور سدید نے اپنایا ہے اور بہت حد تک اس انداز کو نبھا بھی گئے۔اب غالب تو چونکہ غالب ہیں اس لیے کوئی ان کے مقابلے اور ٹکر کا تو نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی اس انداز کو بعینہٖ اپنا سکتا ہے لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے عہد کے غالب سے بہت خوبصورتی سے رنگ غالب کو برتا ہے اور ہمیں کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اسد اللہ خان غالب کے روبرو ہیں۔

مکتوب نگاری ہو یا ادب کی کوئی بھی اور صنف خصوصاً نثر میں ہمیں طنز ومزاح کے عناصر ضرور ملتے ہیں۔ غالب کے ہاں مکتوب نگاری میں ہمیں طنز ومزاح دونوں ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ غالب کے مکتوبات کی پیروی کرتے ہوئے انور سدید نے بھی غالب کے نئے خطوط میں مزاح کا استعمال خوب کیا ہے اور اس کے ذریعے شگفتگی پیدا کی ہے۔ مزاح کے ذیل میں تو ہم نے دونوں کے مکاتیب کا جائزہ لے لیا ہے اور چیدہ چیدہ مثالوں کے ذریعے وضاحت بھی کر دی ہے۔ اب ذرا طنزیہ لہجے کے استعمال کی طرف چلتے ہیں کہ اس عنصر کو کس حد تک غالب نے اپنے مکتوبات میں برتا ہے اور پھر ان کی پیروی میں نئے دور کے ہمارے غالب انور سدید نے اس کو کس حد تک مکاتیب میں استعمال کیا ہے اور آیا وہ انداز غالب کے ساتھ انصاف کر بھی پائے ہیں یا نہیں۔ اس سے قبل ہم طنز کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مزاح کے مقابلے میں طنز درحقیقت ذرا سخت قسم کے لہجے کے ذریعے معاشرے کو اس کی خامیوں سے آگاہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دفعہ طنز انفرادی نوعیت کا بھی ہوتا ہے جس میں فرد واحد کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اب ذرا غالب اور انور سدید کے ہاں اس کی کاٹ دیکھتے ہیں: میر مہدی مجروح کو غالب ایک جگہ لکھتے ہیں:

> پنشن کا حال کچھ معلوم ہوا ہو تو کہوں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملے میں ہر چند کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہر حال اتنا سنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم وہا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ بس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم نہ کسی کو خبر۔ ۳۱

ایک اور جگہ غالب منشی شیو نرائن کو ایک مکتوب میں معاشرتی حالات وواقعات پر طنزیہ انداز میں عرض مدعا بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا اس معاشرتی حالات پہ غالب کا طنز ملاحظہ فرمائیں:

> یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے۔ کاغذ روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے۔ ۳۲

یوں غالب کے ہاں ہمیں طنز کی کاٹ دکھائی دیتی ہے۔جو بڑی ہی کاری ہے۔اس کے ذریعے وہ اپنے مطلب کی بات کر جاتے ہیں۔اب ذرا غالب کی تقلید میں خطوط لکھنے والے ڈاکٹر انور سدید کو ملاحظہ فرمائیں کہ وہ کس طرح طنز کی کاٹ سے سامنے والے کو زخمی کرتے ہیں اور رنگ غالب کو بہت حد تک اپنائے دکھائی دیتے ہیں۔ذرا دیکھئے تو کس قدر خوبصورت انداز میں اخبارات کی روش پر طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> ایک پرچے میں احوال عذرا اصغر کا تھا۔ساتھ تصویر مشتہر تھی۔جنگ نے گویا لاہور میں آتے ہی گھمسان کارن ڈال دیا ہے۔وہ حوران ارضی جو بقول حفیظ جالندھری "پردے کی تھیں آبادیاں" اور چشم فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی جن کی جھلک اب اخبار کے صفحے پر برسرعام روئے زیبا دکھائی دیتی ہیں۔یہ انداز اخبار جنگ نے عام کیا ہے اور اب نوائے وقت بھی اس روش پر چل نکلا ہے۔۳۳

آگے ذرا ملاحظہ کریں "شخصی طنز" کی خوبصورت مثال۔کس طرح ڈاکٹر انور سدید ہمیں شخصیات پر طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔لکھتے ہیں:

> سرورق کی رائے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا سے لکھواؤ۔عالم بالا میں مشہور ہے کہ ایک دوسرے کی ضد میں لکھتے ہیں۔ایک قاطع دوسرا برہان قاطع۔ تبصرہ اچھا لکھتے ہیں۔تنقید کا حق ادا کرتے ہیں۔لیکن اپنے نظریے پر قطب مینار کی طرح قائم۔مصنف کا بھی تھوڑا بہت چرچا ہوتا ہے۔۳۴

کہتے ہیں کہ ادب خواہ وہ کسی بھی صنف سے متعلق ہو وہ ہمیں ادیب کے ذاتی حالات سے آگاہ ضرور کرتا ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب ایک آئینہ ہے جس میں ہمیں لکھنے والے کی ذات کا عکس واضح دکھائی دیتا ہے۔مکتوب نگاری تو ویسے بھی ایک ایسی صنف ادب ہے کہ جس کے ذریعے ہمیں بہت ہی واضح انداز میں مکتوب نگار کی ذاتی زندگی کے گوشوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔مکتوب نگاری کے میدان میں غالب کو توہم بلاخوف وخطر کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی ذات سے جتنی زیادہ واقفیت ہمیں ان کے خطوط پڑھ کر ہوئی ہے شاید ہی بلکہ یقیناً اتنی ان کی شاعری کے ذریعے نہیں ہوئی کیونکہ خطوط کے ذریعے ان کی زندہ دل اور شگفتہ شخصیت کے ان تمام پہلوؤں

سے پردے اٹھے ہیں جو ان کی شاعری میں مخفی تھے۔غالب سے قبل بھی اگرچہ مکتوب نگاری کے ذریعے ہمیں لکھنے والے کی ذات سے آگاہی ہوتی تھی مگر غالب نے اس کو وسیع کر دیا۔اب کہ خط ذاتی حالات سے آگاہی کا اہم ترین ذریعہ قرار پائے۔خطوط غالب کے جائزے نے اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ ان کے ہاں ہمیں خطوط میں اپنی ذاتی زندگی کے حالات وواقعات نظر آتے ہیں۔ملاحظہ ہو ذرا ایک جگہ ''میر مہدی مجروح'' کو کیسے اپنی صحت اور حالت سے آگاہ کرتے ہوئے ان کو خط نہ لکھنے اور اصلاح نہ کر سکنے سے آگاہ کرتے ہیں:

> بھائی! میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔اب رعشہ وضعف بصارت وہ بھی نہیں ہو سکتا۔جب حال یہ ہے تو کہو صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں؟ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیجا پگھلا جاتا ہے۔دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔رات کو صحن میں سوتا ہوں صبح کو دوآدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ایک کوٹھری ہے اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں۔تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔۳۵

آگے ذرا دیکھئے اپنی غربت اور کسمپرسی کو بیان کرتے ہیں اور اس سے آگاہی ہمیں میر مہدی مجروح کو لکھے ایک خط کو پڑھ کر ہوتی ہے۔انھوں نے ملاحظہ کیجیے کہ کیسے پر اثر انداز میں اپنی حالت زار سے پڑھنے والوں کو آگاہ کیا ہے:

> یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔اس طرح سے خاطر جمع رکھنا۔رمضان کا مہینہ روزہ رکھ کر کاٹا۔آئندہ خدا رزق ہے۔کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔بس صاحب جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی تو پھر کیا غم ہے۔۳۶

میر مہدی مجروح کو ایک اور مکتوب میں اپنے گردوپیش سے آگاہ کرتے اور لکھتے ہیں:

> کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگ ہوئی ہے۔ہوا آرہی ہے۔پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔حقہ پی رہا ہوں۔یہ خط لکھ رہا ہوں۔تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا

سو باتیں کر لیں۔میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو
یہ خط پڑھا دینا اور میری دعا کہہ دینا۔۳۷

غالب کے مکاتیب کے اس مختصر سے جائزے سے ہم نے کوشش کی کہ ہم زیر بحث نکتے کی وضاحت کر پائیں اور ہم اوپر بیان کردہ مثالوں سے بہت حد تک اس بات کو واضح کر چکے ہیں کہ غالب نے اپنے مکاتیب کے ذریعے اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ہمیں بہت حد تک معلومات فراہم کی ہیں۔اب چلتے ہیں غالب کے نئے خطوط کے جائزے کی طرف اور دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید کس حد تک ہمیں ان مکاتیب میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں آگاہی فراہم کرتے ہیں اور رنگ غالب کے ساتھ انصاف کر پاتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے یہاں ڈاکٹر انور سدید نے غالب کے ہی رنگ میں اپنی بیماری کا تذکرہ کیاہے۔انداز دیکھئے:

حضرات کو پتہ نہیں کہ میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پہر پڑا رہتا ہوں۔اصل صاحب فراموش میں ہوں۔درد محلل روح ہے۔ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا ہوں، حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں۔پھر میں کیوں جیتا ہوں، روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں شغل، اختلاط، جلسہ، مجمع، سب مرغوب خاطر ہیں لیکن اب ویرانی سی دل میں مرحوم ہے جیسے رفع کرنے کے لیے تمہیں خط لکھتا ہوں۔۳۸

اب ذرا ملاحظہ ہو یہاں تو ڈاکٹر انور سدید نے ذاتی حالات سے ہمیں آگاہی دلائی اور بعینہ غالب کے ہی الفاظ اٹھا کے لے آئے جو انھوں نے میر ومہدی مجروح کے نام ایک مکتوب میں لکھے تھے۔یہاں تو محسوس ہوا جیسے غالب ہی ہم سے مخاطب ہیں۔آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

اس وقت کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ہوا آرہی ہے، پانی کا جھجر دھرا ہے۔حقہ پی رہا ہوں۔یہ خط لکھ رہا ہوں۔تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔یہ باتیں کر لیں۔۳۹

یوں غالب کے خطوط اور غالب کے نئے خطوط کے جائزے سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ دونوں اپنے خطوط میں ہمیں اپنی ذاتی حالات سے واقفیت بھی دلاتے ہیں۔یہ تمام خطوط ہمیں

ان کی ذاتی زندگی کے گوشوں سے واقفیت دلاتے ہی اور ان کے مسائل سے آگاہ کرتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید ہمیں غالب کی مانند ہی اپنے تمام خطوط میں اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں ادب کو ہم مصنف کی اپنی ذات کا آئینہ قرار دیتے ہیں وہاں اس کو معاشرے سے آگاہی بھی قرار دیتے ہیں۔نہ چاہتے ہوئے بھی مصنف کی تحریروں میں اس کے معاشرے کے حالات امڈ کر سامنے آجاتے ہیں۔وہ خود کو معاشرے کے مسائل سے لاعلم نہیں رکھ پایا۔جس عہد میں کوئی تحریر لکھی جاتی ہے اس عہد کے مسائل اور حالات وواقعات ان تحریروں میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔جب غالب کے خطوط کا جائزہ لیں تو جہاں ان کی ذاتی زندگی کے گوشوں میں ہم جھانک کر اس سے واقف ہوتے ہیں وہیں ان کے عہد کی معاشرت بھی ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ غالب ہمیں وقتاً فوقتاً اپنے عہد کے حالات سے بھی آگاہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی سیاسی حالات پہ تبصرہ کرتے ہیں تو کبھی معاشرتی محفلوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔اب ان کے خطوط سے چند مثالیں ملاحظہ کریں۔ذرا دیکھیں تو سہی یہاں کس قدر خوبصورتی سے منشی ہرگو پال تفتہ کو دلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں جس میں سات سال کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کنپ ہے۔مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سرسرا ہنود۔معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیہ السیف ہیں، وہ پنج پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔۴۰

اوپر بیان کردہ پیراگراف سے ہمیں معلوم ہوا کہ غالب یہاں کس قدر خوبصورت انداز میں اپنے عزیز از جان ہندو شاگرد ہرگو پال کو ماضی کی دلی اور موجودہ دلی کے درمیان فرق کو کر رہے ہیں۔انداز بیان کمال ہے۔ایک اور جگہ دیکھیں میر مہدی مجروح کو لکھنو کے حالات سے آگاہی دلا رہے ہیں:

> بھائی لکھنو میں وہ امن وامان ہے کہ نہ ہندوستانی عمل داری میں ایسا امن وامان ہو گا نہ اس فتنہ وفساد سے پہلے انگریزی عمل داری میں یہ چین ہو

گا۔امرا اور شرفا کی حکام سے ملاقاتیں، بہ قدر رتبہ، تعظیم وتوقیر، پنشن کی تقسیم علی الصموم، آبادی کا حکم عام، لوگوں کو کمال لطف اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔۴۱

یہ تو ہوئی خطوط غالب سے مثالیں اور ان سے واضح بھی ہو چلا کہ غالب کے ہاں ہمیں معاشرتی عکس واضح ملتا ہے۔آپ نے اپنے اردگرد کے حالات وواقعات کو اپنے خطوط میں بیان کیا ہے۔خطوط غالب کے ذریعے جتنا اس وقت کے معاشرے کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں شاید اتنی اس دور کے حالات کے بارے میں لکھی گئی کتابوں سے بھی نہیں ملتی ہے۔ یوں خطوط غالب اپنے معاشرے کے عکاس وآئینہ دار ہیں۔غالب کے نئے خطوط ہمیں اپنی عہد کی معاشرت وتمدن سے آگاہ کرتے ہیں یا نہیں اس کا ثبوت ان خطوط کے جائزے کے بعد ہوتا ہے کہ ہمارے اس نئے عہد کے غالب نے اپنے خطوط میں ذاتی حالات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گردوپیش سے بھی آگاہ کیا ہے۔انھوں نے بہت ہی واضح انداز میں معاشرتی حالات سے اپنے قاری کو آگاہ کیا ہے۔یوں یہ چیدہ مثالیں ملاحظہ ہوں۔یہاں دیکھیں ڈاکٹر انور سدید اہل قلم کی طرف سے کی جانے والی ایک محفل کا ذکر کس خوبصورت انداز میں کرتے ہیں:

میری جان! معلوم ہوا کہ ایک کانفرنس اہل قلم کی بصدا احتشام، انصرام وانتظام منعقد ہوئی۔منصرم اس کے اکادمی ادبیات پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل مسیح الدین صدیق تھے۔اہتمام اس کا شاہانہ اور انتظام شاعرانہ تھا۔۴۲

ذکر ہوا اہل قلم کی محفل کا اور انور سدید ایک طرح سے ایک ادبی ترجمان کا کردار بھی ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ ان تمام خطوط کے ذریعے سے ادب کے فروغ کے لیے کام کرنے والوں کو خراج تحسین بھی پیش کرتے ہیں اور معاشرے میں ہونے والی ادبی تقاریب کا احوال بیان کرتے ہیں۔خود بھی فروغ ادب کے لیے کاوش کرتے ہیں اور اس کام کو کرنے والوں کو سراہتے بھی ہیں۔آگے ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:

تم نے سنا وزیر آغا نے اب لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا ہے؟ سرگودھا ویران اور شام دوستان برباد ہو گئی۔غلام جیلانی اصغر اب اپنے کالج کے بچوں کے

تیور ٹھیک کر رہا ہے۔ جمیل یوسف راولپنڈی اور کراچی اور لاہور کے زہرہ جمالوں کو ملتفت کرنے میں مصروف ہے۔۴۳

ملاحظہ کیا ڈاکٹر انور سدید کا انداز بیان ہلکے پھلکے مزاح کے انداز میں وہ کس قدر خوبصورتی سے احوال دوستان بیان کر رہے ہیں۔یوں واضح ہوا کہ غالب کی طرح یا غالب کی تقلید کرتے ہوئے نئے دور کے نئے غالب نے بھی اپنے مکاتیب میں معاشرتی حالات وواقعات سے ہمیں آگاہ کیا ہے مگر ان کا انداز تھوڑا اس لحاظ سے مختلف ہے کہ غالب نے اپنے مکاتیب میں معاشرے کو مجموعی طور پر دیکھا ہے اور اس پر بات کی ہے مگر جہاں تک بات ڈاکٹر انور سدید کی ہے تو انھوں نے زیادہ تر ادبی حالات وواقعات اور ادبی محفلوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔یوں وہ ایک خاص طبقے کی بات کرتے ہیں:

استفہامیہ انداز یا سوالیہ انداز اگلے کو سوچنے کی دعوت دینے کا ایک پیغام ہے۔یہ انداز ہمیں مکتوب نگاری میں غالب کے ہاں بہت ہی واضح دکھائی دیتا ہے۔غالب اپنے مکاتیب میں بہت جگہ سوالیہ انداز کو اپنا کر اگلے کو سوچنے پر مائل کرتا ہے۔بڑے ہی خوبصورت انداز میں کوئی بات کرتے کرتے اچانک سے غالب سوالیہ انداز اپنا کر مکتوب الیہ کو حیرت میں مبتلا کرتے ہیں۔یہ انداز ہمیں غالب کے ہاں شاعری میں بھی بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔وہ اشعار میں بھی کیوں، کیا اورکیسے وغیرہ جیسے الفاظ بے تحاشہ لاتے ہیں اور یہ تمام سوالیہ الفاظ ان کی شاعری کو بہت ہی خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔مکتوب نگاری میں غالب نے اس سوالیہ انداز کو ایک خاص پہچان عطا کی ہے۔اس طرز کو دوسرے مکتوب نگاروں نے بھی اپنایا ہے اور رنگ غالب کو اپنانے کی سعی کی ہے۔ان میں ڈاکٹر انور سدید بھی شامل ہیں۔انھوں نے غالب کے رنگ میں جو خطوط لکھے ہیں ان میں اس انداز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ان کا لہجہ بھی بہت جگہ سوالیہ ہے۔اب ذرا دونوں کے مکاتیب کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ دونوں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ذرا دیکھئے غالب صاحب منشی شیو نرائن کو خط لکھتے ہیں اور ان سے منشی ہرگو پال کے بارے دریافت کرتے ہیں۔ انداز دیکھیں:

سخت حیرت میں ہوں کہ منشی ہرگوپال صاحب نے مجھ کو خط لکھنا کیوں چھوڑا۔ اگر مجھ سے خفا ہیں، تو کیوں خفا ہیں، اور اگر شہر میں نہیں تو کہاں گئے؟ اور کیوں گئے؟ اور کب تک آئیں گے؟۴۴

اوپر بیان کردہ مثال میں کس قدر خوبصورتی سے غالب نے بیک وقت کتنے سوالات کر ڈالے ہیں۔ کہاں، کیوں اور کب کو کس قدر مہارت سے ایک ساتھ لائے ہیں۔ منشی ہرگو پال نفتہ غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ہیں۔ ان کے خط نہ لکھنے اور بات نہ کرنے پر غالب پریشان ہیں اور اس پریشانی میں ان کی ہرگو پال کے لیے محبت جھلکتی ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے۔ اب آگے دیکھیں، میر مہدی مجروح کو شہر میں ہونے والے حالات وواقعات کی خبر دے رہے ہیں۔ مکانوں اور بازاروں کے منہدم کرنے کی داستان بیان کر رہے ہیں۔ آپ بھی دیکھیں:

یہاں شہر ڈھ رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار، اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبان امکنہ اور دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دوکان کہاں تھی؟۴۵

اس اوپر بیان کردہ مثال سے جہاں مکتوب نگاری میں ہمیں غالب کا استفہامیہ لہجہ دکھائی دیتا ہے وہیں ہمیں اس کے ذریعے معاشرتی حالات وواقعات سے آگاہی بھی ملتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں مکانات اور بازار وغیرہ گرائے جا رہے ہیں اور اس انہدام کے نتیجے میں غالب مہدی مجروح کو بتا رہے ہیں کہ مالکان اب نہیں بتا پاتے اور نہ ہی فرق کر پاتے ہیں کہ ان کا مکان اور دوکانیں کہاں اور کس جگہ تھیں۔ اب ذرا دیکھتے ہیں غالب کی پیروی اور تقلید کرنے والے ڈاکٹر انور سدید کے غالب کے نئے خطوط کہ ان میں کس حد تک انورسدید نے رنگ غالب کو برتا ہے اور سوالیہ لہجہ اپنا کر سوچنے کی دعوت دی ہے۔ اب ذرا دیکھیں یہاں کس قدر خوبصورتی سے سوالات کی بوچھاڑ کی ہے۔

میاں! پذیرائی خواتین یک فرض عین ہے، سرور مجاز اس میں مانع کیوں؟ کیا مقصود یہ کہ سب لوگ غالب خستہ کی طرح آنکھوں پر احترام وحیا کی پٹی

باندھ لیں اور جو کوئی خوبرو سامنے آئے تو آنکھیں جھکا لیں۔ اے بھائی کیوں؟۴۶

کیا عمدہ انداز بیان ہے نئے عہد کے نئے غالب کا۔ مزاج کے پیرائے میں سوالیہ انداز اپنائے ہوئے اپنی بات کو کس قدر عمدگی سے بیان کیا ہے۔اس انداز میں ایک بہت خوبصورتی اور بے ساختگی دکھائی دیتی ہے۔

زندگی میں دوستی کی اہمیت بے پناہ ہے۔ جہاں خون کے رشتے بہت ہی زیادہ اہمیت حامل ہیں ان کے بغیر انسان کا زندگی گزارنا محال ہوتا ہے۔ ایسے ہی دوست احباب کا ساتھ بھی اہم ترین ہوتا ہے۔ دوستی کے لازوال رشتے کے بغیر زندگی بے رنگ اور پھیکی پڑ جاتی ہے۔ دوست زندگی میں آکسیجن کا کردار ادا کرتے ہیں جیسے آکسیجن کے بغیر سانس لینا محال ہو جاتا ہے ایسے ہی دوستوں کے بغیر بھی جینا مشکل بن جاتا ہے۔غالب کے ہاں دوست سانس کی آمد ورفت کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے احباب کی محبت کا دم بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے تمام تر مکاتیب ان کے دوستوں سے ان کی محبت اور خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ وہ خط وکتابت کے ذریعے سے اپنے دوستوں کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں۔ان خطوط میں وہ محبت سے کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ ہمیں چھیڑ چھاڑ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تو کبھی ہلکے پھلکے مزاح میں ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی محبت دکھائی دیتی ہے جو انہیں اپنے احباب سے ہے۔ اگر کبھی کسی دوست کا خط آنے میں دیر ہو جائے یا وہ جواب دینے میں کوتاہی کر دے تو غالب ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں اور اگلے خط میں اسے ضرور محبت کے انداز میں تنبیہ کرتے ہیں۔خط کا جواب جلدی دینے اور اپنے احوال سے دریافت کرنے کے بارے میں ان کی ہر ہر ادا سے محبت اور خلوص جھلکتا ہے۔ان کے خطوط کا جائزہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ غالب نے اپنے مکاتیب میں بہت جگہ اپنے احباب کا تذکرہ کیا ہے اور بہت ہی محبت سے کیا ہے۔ اب ذرا ان کے مکاتیب سے کچھ مثالیں لیتے ہیں جو اس بات کی وضاحت کریں گی کہ غالب نے اپنے مکاتیب میں اپنے احباب کا ذکر شدومد سے کیا ہے۔ یہاں دیکھئے میر مہدی مجروح کو اپنے احباب کی بابت بتا رہے ہیں:

میکش چین میں ہے۔ باتیں بناتا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا۔ اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ میرن صاحب کی خیر عافیت معلوم ہوئی مگر نہ معلوم ہوا کہ وہ مع قبائل ہیں یا تنہا۔ اگر تنہا ہیں تو قبائل کہاں ہیں؟ ۴۷

اوپر بیان کردہ مثال سے واضح ہو چلا کہ غالب اپنے مکاتیب میں اپنے احباب کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کے بارے میں دریافت کرتے دکھائی دیتے ہیں یا ان کی بابت ہمیں معلومات باہم دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب ذرا اگلے خط میں ملاحظہ کریں میر مہدی مجروح کو ایک جوان لڑکے کی موت کی خبر دے رہے ہیں جو ان کے کسی جاننے والے کا رشتہ دار ہے۔ مثال دیکھیں:

بے چارہ منشی میر احمد حسن کا بھتیجا۔ میر امداد علی آشوب کا بیٹا، محمد میر شب گزشتہ کو گزر گیا۔ آج صبح کو اس کو دفن کر آئے جوان، صالح، پرہیز گار، مومنین کا پیش نماز تھا۔ ۴۸

یہاں بھی انھوں نے ہمیں اپنے احباب کے احوال سے واقف کرایا ہے۔ غرض غالب کے ہاں احوال دوستان ہمیں بہت زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ دوستوں کی محبت ان کی زندگی کا حاصل ہے۔ وہ دوستوں کی یاد میں رہتے ہیں اور اس کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔ یہ بات ان کے خطوط کے مطالعے کے بعد عیاں ہوتی ہے۔ اب ذرا احوال دوستاں کا انور سدید کے ہاں جائزہ لیتے ہیں کہ انھوں نے بھی اپنے خطوط میں اپنے دوستوں کی بابت ہمیں آگاہ کیا ہے یا نہیں۔ غالب کے نئے خطوط جو غالب کے پیرائے میں ہی انور سدید نے لکھے ہیں۔ ان میں دیگر امور جو ہمیں غالب کے ہاں ملتے ہیں وہی کافی حد تک ہمیں انور سدید کے ہاں بھی بدرجہ اتم دکھائی دیتے ہیں۔ اب احوال دوستاں کا تذکرہ چھڑا تو ذرا انور سدید کے مکاتیب کا مختصر جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کس حد تک اس میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ ذرا ایک مثال ملاحظہ ہو:

خالد احمد کے گھر میں دختر کی ولادت کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے۔ کچھ عرصے سے وہ روش عزیز کی مائل بہ سنجیدگی ہے۔ یہ دختر فرخندہ اختر ہے۔ اب جو ان سے ملو تو میرا سلام کہہ کر ان کی خیریت دریافت کرو۔ ۴۹

یوں معلوم ہوا کہ تقلید غالب یہاں بھی ملحوظ خاطر رکھی جا رہی ہے اور ڈاکٹر انور سدید اپنے عزیز واقارب کے احوال سے ہمیں باخبر رکھتے ہیں اور ان کے لیے بھی ان کے دوست احباب آکسیجن کی مانند ہیں۔

مکالمہ ایک ایسا انداز بیان ہے جس میں دو اشخاص آپس میں باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔دونوں حضرت عام گفتگو کا انداز اپناتے ہیں اور روز مرہ کے کسی واقعے کو بیان کرتے اور اس پر بحث کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

غالب سے قبل مکتوب نگاری میں مکالمہ نگاری کا انداز ہمیں مفقود دکھائی دیتا ہے۔مگر یہ اعزاز بھی غالب کے حصے میں آیا ہے کہ انھوں نے مکتوب نگاری میں پہلی دفعہ مکالمہ شامل کیا۔ مطلب مکالمہ نگاری کا انداز اپنایا۔وہ خط میں تحریر یوں کرتے گویا وہ جس کو خط لکھ رہے ہیں وہ ان کے سامنے موجود ہے۔وہ سامنے بیٹھا ان سے باتیں کر رہا ہے۔یوں غالب نے حقیقی معنوں میں خط کو آدھی ملاقات بنا دیا ہے۔ایک ایسی ملاقات جس میں ہم اپنے سامنے موجود شخص سے بزبان قلم دل کی باتیں کر کے اپنے دل کا حال بیان کر لیتے ہیں۔یوں غالب نے وہ انداز اپنایا کہ فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔خط کو غالب ہزار کوس سے بیٹھے بزبان قلم باتیں کرنے کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔غالب کے مکاتیب میں ہمیں مکالمہ نگاری بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ایک مثال دیکھئے میر مہدی مجروح سے یوں مخاطب ہیں گویا وہ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں:

> ارے میاں! تم نے کچھ اور بھی سنا؟ کل یوسف مرزا کا خط لکھنو سے آیا۔وہ لکھتا ہے کہ نصیر جان عرف نواب خان والدان کا دائم الحبس (عمر قید) ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیا آفت آئی۔یوسف مرزا جھوٹ کا ہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اس نے جھوٹ سنا ہو۔لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ، میں تو روٹی کھانے کو جاتا ہوں۔۵۰

اس اوپر والے اقتباس کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا ڈاکٹر انور سیدید میر مہدی مجروح کو اپنے سامنے بٹھا کر ان سے باتیں کیے جا رہے ہیں۔کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ خط لکھ رہے ہیں۔اب ذرا دیکھتے ہیں تقلید غالب میں غالب کے نئے خطوط لکھنے والے ڈاکٹر انور سدید

کو کہ وہ اس مکالمہ نگاری کے انداز کو کس حد تک نبھا پائے ہیں۔ان کے ہاں ہمیں رنگ غالب واضح دکھائی دیتا ہے۔وہ بہت حد تک غالب کے رنگ کو اپنانے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ان کے خطوط کے جائزے سے بات بہت حد تک واضح ہو چکی ہے کہ انھوں نے جو سعی کی ہے وہ بے کار نہیں گئی بلکہ رنگ لائی ہے۔ان کے مکاتیب میں ہمیں غالب کی طرح مکالمہ نگاری کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔وہ بھی ایسا انداز اپناتے ہیں گویا وہ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔بے ساختہ باتیں جن میں محبت اور خلوص کا رنگ واضح ہے۔وہ ایک مہربان دوست کی مانند مکتوب علیہ سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ایک انداز ملاحظہ ہو:

> میاں اظہر جاوید! یہ سب القاب محبت کے ہیں اور میرے وخور محبت کا برا نہ منانا۔امجد اسلام نے پیر ومرشد احمد ندیم قاسمی کو نقاد کہا ہے۔کیا انھوں نے برا مانا؟ نہ سیل چہل پہ بات تم سے دریافت کرتا ہوں۔۵۱

ڈاکٹر انور سدید کا انداز مکالماتی رنگ ڈھنگ لیے ہوئے ہے۔یوں ہی محسوس ہو رہا ہے کہ اظہر جاوید ان کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔یہاں پیروی غالب بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔وہی انداز وہی رنگ ہے جو غالب نے اس ضمن میں اپنایا ہے۔

منظر نگاری سے مراد ہے کہ کسی منظر کی جزئیات کو اس طرح بیان کرنا کہ سارا منظر نگاہوں کے سامنے واضح ہو جائے۔یوں محسوس ہو کہ تمام تر واقعات ہماری نگاہوں کے سامنے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔اس میں ادیب یا مصنف یوں تحریر لکھتا ہے اور اس طرح الفاظ کا چناؤ کرتا ہے کہ گویا ہم اس سارے منظر کا حصہ ہیں۔منظر نگاری کمال مہارت کا تقاضا کرتی ہے۔غالب چونکہ دنیائے سخن کے امام ہیں۔وہ سب پر غالب ہیں۔مکتوب نگاری میں بھی ہمیں ان کے پائے کا کوئی نہیں ملتا ہے۔یہاں بھی وہ اپنی فنی ہنر مندی کو بروئے کار لاتے ہوئے کمال کے مکاتیب لاتے ہیں جو اپنے اندر بے پناہ خوبصورتی اور پڑھنے والوں کے لیے کشش رکھتے ہیں۔جہاں بات کی جائے منظر نگاری کی تو اس میں بھی ہم غالب کو کمال درجے پر پاتے ہیں۔منظر نگاری میں بھی ان کو نہایت ہی مہارت حاصل ہے۔ان کے مکاتیب کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا

ہے کہ یہاں بھی غالب نے کمال عمدگی سے مناظر کی وضاحت کی ہے۔منظر نگاری اتنی خوبصورتی سے کی ہے کہ ہم بیان کیے جانے والے منظر میں کھو جاتے ہیں۔اب یہاں ذرا ملاحظہ ہو کس طرح غالب ایک جگہ میر مہدی مجروح کو اپنے اردگرد موجود چیزوں کے بارے میں بتا رہے ہیں:

> کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگ ہوئی ہے۔ہوا آرہی ہے۔پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔حقہ پی رہا ہوں۔یہ خط لکھ رہا ہوں۔تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا سو باتیں کر لیں۔۵۲

اوپر بیان کردہ مثال سے واضح ہوا کہ منظر بیان کرنے میں غالب کو کمال مہارت حاصل ہے۔وہ منظر کی تمام تر جزئیات کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔اب یہاں ہی دیکھ لیں۔اپنی کوٹھری کو دیکھایا ہے جس میں وہ اس وقت بیٹھے ہیں۔ہوا کے چلنے اور اندر ان کی کوٹھری میں آنے کی بھی منظر نگاری کی ہے۔ساتھ ان کی کوٹھری میں پانی کا ایک جھجر دھرا ہے اس کو بھی بیان کیا گیا ہے۔اپنے حقہ پینے کی بابت بھی آگاہ کیا ہے۔گویا میر مہدی کو کوٹھری میں ساتھ بٹھا لیا ہے اور ان کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔کمال مہارت سے سارا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے مجسم کیا ہے۔اب ذرا آگے چلیے۔ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔میر مہدی کو ہی ایک اور مکتوب میں برسات کے متعلق بتا رہے ہیں اور اس سے جو تباہی ہو رہی ہے اس کو منظر کشی کے ذریعے بیان کر رہے ہیں ملاحظہ ہو:

> برسال کا حال نہ پوچھو۔خدا کا قہر ہے۔قاسم جان کی گلی سعادت خان کی نہر ہے۔میں جس مکان میں رہتا ہوں۔عالم بیگ خان کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔مسجد کی طرف دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا وہ گر گیا۔سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔صبح کے بیٹھے کا حجرہ جھک رہا ہے۔چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔۵۳

کیا کمال منظر نگاری ہے! غالب نے ایک ایک جزو کو اس قدر خوبصورتی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ ہر چیز ہماری نظر کے سامنے واضح ہو گئی ہے۔غالب نے جو چیز دکھانا چاہی ہے وہ ہمیں دکھا دی ہے۔اب ذرا غالب کے نئے خطوط کی طرف چلتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید کے ان تمام خطوط کا مطالعہ بھی واضح کرتا ہے کہ غالب کی طرح انھوں نے بھی منظر نگاری کی ہے اور

صورت واقعہ کی تمام تر جزئیات کی وضاحت کی ہے اور منظر کشی کر کے کمال مہارت سے اپنی بات کو مکمل کیا ہے۔ایک مثال دیکھیں:

> منڈیر کے پاس جو تخت بچھا ہے اس پر بیٹھا ہوا دھوپ کھا رہا ہوں۔اے لو یہ سامنے کون آرہا ہے؟ تین کتابیں، مجلا وہ مطلا ہاتھ میں تھامے! اخاہ! ن م راشد۔جی حضرت آپ کہاں؟ آپ کا ذکر تو ابھی اظہر جاوید سے کر رہا تھا۔۵۴

واہ! کیا خوبصورت انداز بیان ہے۔کتنی عمدگی سے ڈاکٹر انور سدید نے اپنی اردگرد کی جزئیات سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔اپنے اردگرد کی منظر کشی کمال عمدگی سے کی ہے۔یہاں جو ذکر چھیڑا ہے ن م راشد کا وہ کیا ہی خوب ہے۔اپنے دور کے ایک باغی شاعر کا تذکرہ خوب کیا ہے اور ان کی اپنے پاس آمد کا تذکرہ خوب کیا ہے۔مکالمہ نگاری والا انداز بھی ہے۔غالب کی طرح ان کی تقلید میں ڈاکٹر انور سدید نے بھی اپنے مکاتیب میں منظر نگاری کی ہے اور خوب کی ہے۔

قافیہ بندی سے مراد ہے کہ تحریر میں ایک جگہ ہم آواز لفظ کو لے کر آنا۔اس سے عبارت میں ایک طرح کی خوبصورتی اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے۔قافیہ خصوصاً تو شاعری کے ساتھ مخصوص ہے۔شاعری میں قافیہ شاعر استعمال کرتے ہیں اور دراصل یہی قافیہ ہے جو شاعری کو خوبصورتی عطا کرتا ہے۔قافیہ شاعری کی پہچان ہے۔غالب چونکہ شاعری میں اپنی جگہ ایک پورا دبستان ہیں۔شاعری کی دنیا میں امام وپیشوا مانے جاتے ہیں۔اس لیے آپ نے جب مکاتیب لکھنے شروع کیے تو ان میں بھی شاعری والے کچھ انداز اپنائے جو غالب کے ساتھ مخصوص ہیں۔مکاتیب کا جائزہ اس بات سے پردہ اٹھاتا ہے کہ غالب نے قافیہ بندی کے استعمال سے تحریر میں حسن پیدا کیا ہے۔بہت جگہ غالب نے ہم آواز الفاظ لائے ہیں جو بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔اب ذرا قافیوں کے استعمال کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں جو غالب نے اپنے مکاتیب میں برتی ہیں۔یہاں ذرا ملاحظہ ہو۔ایک جگہ میر مہدی مجروح کو کس قدر خوبصورت انداز میں ان کے لیے اپنی فکر مندی کا اظہار کر رہے ہیں کہ انھوں نے بہت عرصے سے غالب کو کوئی خط نہ لکھا اور ساتھ ہی اپنی طرف سے خط کا جواب دیر سے دینے پر ان کو وضاحت بھی کر رہے ہیں کہ جاڑے کے باعث بے حس وحرکت رہا ہوں تو خط کا جواب نہیں دے پایا۔یہاں ذرا قافیہ بندی کا استعمال ملاحظہ ہو:

مگر حیران ہوں کہ کیا سحر سازی کروں جو سخن پردازی کروں؟ بھائی تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو، اردو بازار میں ہنر کے کنارے رہتے رہتے رودنیل بن گئے ہو۔ کیا قتیل کیا رود نیل۔ یہ سب ہنسی کی باتیں ہیں، لو سنو، اب تمہاری دلی کی باتیں ہیں۔۵۵

غالب کے لائے ہوئے قافیے کمال کے ہیں اور ان کی بدولت ایک خوبصورتی پیدا ہوئی ہے۔کیسے یہاں انھوں نے میر مہدی مجروح کو مرزا قتیل کی مثل قرار دیا ہے اور اس مرزا قتیل کے ساتھ کیا ہی عمدہ قافیہ جوڑا ہے۔رودنیل تو کمال ہی ہو گیا۔یہ غالب کا زبان پہ موجود عبور اور زبان کے بارے میں ان کی وسیع معلومات کا پتہ بھی دیتا ہے۔غالب کے ہاں ہمیں الفاظ کی رنگارنگی اور تنوع دکھائی دیتا ہے جو ان کا خاصہ ہے اور یہ تنوع ہمیں غزل اور نثر دونوں میں دکھائی دیتا ہے۔میر مہدی مجروح کے ہی نام ایک اور مکتوب کا آغاز ہی بڑے عمدہ طریقے سے اور قافیوں کے استعمال سے کرتے ہیں۔مکتوب کا یہ آغاز ہی اس مکتوب کو انفرادیت دے جاتا ہے اور ہماری اس میں دلچسپی کو بڑھا دیتا ہے۔اب ذرا اس کا آغاز ملاحظہ کریں:

سید صاحب!

نہ تم مجرم نہ میں گنہگار۔ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔۵۶

یہ تو ہوا غالب کا انداز اور ان کے مکاتیب میں سے چند منتخب شدہ ٹکڑے جن میں انھوں نے قافیے استعمال کیے ہیں اور اپنی نثری عبارت میں شاعرانہ شان پیدا کی ہے۔اب ذرا غالب کے نئے خطوط کی جانب چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ غالب کی پیروی و تقلید میں ڈاکٹر انور سدید نے کس طرح ان خطوط میں قافیہ کو برتا ہے۔ آیا انھوں نے غالب کی طرح ان تمام مکاتیب میں قافیہ بندی کو استعمال کیا ہے یا نہیں۔اس کے لیے ان کے مکاتیب کا جائزہ لینا پڑے گا۔یہاں ذرا نئے دور کے غالب کا انداز ملاحظہ ہو۔ان کے انداز میں ایک حسن ہے جو ہمیں ان کی تحریر کی جانب کھینچ کے لے جاتا ہے۔ مزاح کے پیرائے کو اپناتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید اپنی بات بہت ہی خوبصورتی سے کرتے ہیں اور قافیے بھی اس طرح کے لاتے ہیں جو بہت ہی خوب معلوم ہوتے ہیں۔ذرا آپ بھی یہ مثال ملاحظہ کریں اور لطف لیں:

اے بھائی! علاقہ محبت ازلی کو برحق مان کر اور پیوند غلامی جناب علی مرتضی کو سچ جان کر ایک بات کہتا ہوں کہ بینائی اگرچہ سب کو عزیز ہے اور حسینوں ہ جبینوں کا جلوہ مثل کحل جواہر ہے مگر شنوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے مانا کہ روشنائی اس کے اجارے میں آئی ہے اور یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔۵۷

واہ! واہ! کیا عمدہ اسلوب ہے۔یکدم تو یوں لگتا ہے کہ مرزا اسد اللہ خان غالب ہی ہیں جو اپنے شگفتہ اسلوب کی بدولت ہمیں محظوظ کر رہے ہیں۔یہاں ہمیں لمحہ بھر کو گمان گزرتا ہے کہ ہم غالب کو ہی سن رہے ہیں اور لطف اٹھا رہے ہیں۔

اختتامیہ خط کا آخری حصہ ہوتا ہے۔جہاں پہ خط لکھنے والا مکتوب الیہ کو دعائیہ الفاظ سے نوازتا ہے اور اس کے لیے محبت بھرے الفاظ لاتا ہے۔یہاں وہ اپنی بات کو اختتام تک لاتا ہے اور خط کو ختم کر دیتا ہے۔غالب چونکہ ہر معاملے میں اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے قائل ہیں۔سو وہ اختتامیہ میں بھی ذرا دوسروں سے منفرد انداز اختیار کرتے ہیں۔غالب جب بھی خط کا اختتام کرتے ہیں تو وہ اس کے آخر میں تاریخ، سال اور دن لکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ بعض جگہوں پر مکتوب الیہ کے لیے محبت اور پیار کا اظہار بھی ضرور فرماتے ہیں۔چند مثالیں ذرا دیکھتے ہیں۔میر مہدی مجروح کو ایک جگہ خط کے اختتام میں لکھتے ہیں:

اس وقت تمہارا خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزا ملا تو دونوں کا جواب بھی لکھ کر روانہ کیا۔اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔

میر سرفراز حسین، میرن صاحب اور میر نصیر الدین کو دعا۔دوشنبہ ہفتم مارچ ۱۷۵۸ء، یکم شعبان ۱۲۷۵ھ۔۵۸

یہاں ایک تو اس بات کی وضاحت ہوئی کہ آخر میں غالب نے دعا سلام دی ہے اپنے عزیز واقارب کا نام لے کر اور دوسرے انھوں نے یہاں تاریخ، دن، سال سب کی وضاحت کی ہے۔اس سے ہمیں مکمل پتہ چلتا ہے کہ غالب نے خط کس دور، دن اور تاریخ میں لکھا ہے۔گویا

ہم غالب کے خطوں سے پورا عہد مرتب کر سکتے ہیں۔ آگے دیکھئے منشی ہرگوپال نفتہ کے نام لکھتے ہیں:

یہ سطریں جواب میں ہیں تمہارے اس خط کے کہ جو آج اس وقت ڈاک سے میں نے پایا ہے۔

نیم روز دوشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء۔۵۹

یہاں غالب نے دعا سلام تو نہیں دیا مگر تاریخ، دن، سال وغیرہ کا حوالہ دینا ضروری خیال کیا ہے کیونکہ غالب کے کم وبیش ہر ہی خط میں ہمیں دن، تاریخ، سال کا ذکر کھائی دیتا ہے۔ یہ حوالہ ہمیں ہر جگہ، ہر خط میں دکھائی دیتا ہے۔ اب ذرا ہم چلتے ہیں غالب کے نئے خطوط کی سمت اور دیکھتے ہیں وہاں پہ اختتامیہ کس طرح کا ہے اور ڈاکٹر انور سدید کس طرح کے اختتام الفاظ لائے ہیں۔ ذرا ایک انداز ملاحظہ ہو:

کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے۔ اگر جلد آگیا تو آج، ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو اجر دے اور جیتا رکھے۔

جواب خط کا طالب

غالب

بمطابق ۸ رمضان المبارک۔۱۴۰۱ھ

بکشنبہ، گیارھویں جولائی ۱۹۸۱ء۔۶۰

یہاں رنگ غالب دکھائی دیتا ہے کہ غالب کی ہی مانند ڈاکٹر انور سدید نے یہاں دن، تاریخ اور سال کا ذکر کیا ہے۔ ہاں یہاں ایک بات جو غالب سے ہٹ کر ہے کہ خط کے آخر میں غالب نے لکھا گیا ہے۔ یعنی لکھنے والے نے اپنے نام آخر میں دیا ہے جبکہ اس کے برعکس جو پچھلے صفحے میں ہم غالب کے خطوط سے مثالیں دی ہیں۔ ان میں خط کے آخر میں لکھنے والے یعنی غالب نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ مگر یہاں نئے دور کے نئے غالب یعنی ہمارے ڈاکٹر انور سدید نے آخر میں نام لکھنا مناسب خیال کیا ہے۔ ایک اور اختتامیہ ملاحظہ ہو:

پروین عاطف کو میرا سلام سابقہ پہنچایا تھا؟ نہیں تو اب پہنچا دو! کہو کہ میں
اس کے سفر نامے کا مداح ہوں!
۲۳ اپریل ۱۹۸۱ء عیسوی
بروز جمعرات
رحم وکرم کا طالب
غالبؔ

یہاں بھی وہی غالب کا رنگ جھلکتا ہے۔سلام، دعا دینے کی آخر میں تاکید پائی جاتی ہے اور دن، تاریخ اور سال کا ذکر بھی مذکورہ ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختتامیہ میں بھی ڈاکٹر انور سدید نے غالب کی پیروی کی ہے اور ان کے رنگ کو اپنایا ہے۔

(ب) غالب کے نئے خطوط ناقدین کی آرامیں:

غالب کے نئے خطوط کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید نے جو پندرہ خطوط ادبی رسالے "تخلیق" کے مدیر "اظہر جاوید" کے نام لکھے ان کا جائزہ ہم نے گزشتہ صفحات کے ذیل میں لیا ہے۔اس تمام تر جائزے کے بعد میری ناقص رائے کے مطابق ڈاکٹر انور سدید نے غالب کی پیروی وتقلید کا حق بہت حد تک ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔بہت سی جگہوں پر ہمیں یہ تمام خطوط پڑھتے ہوئے محسوس ہوا کہ جیسے خود حضرت غالب ہی ہم سے مخاطب ہیں وہی شگفتہ پیرائے اظہار جو غالب کے ساتھ مخصوص ہے۔طنز کی کاٹ بھی بعض جگہ وہی ہے جو غالب کے ہاں ملتی ہے۔اگرچہ غالب کی پیروی تو کم وبیش ہر ہی دور کے شاعر، ادیب، نثر نگار اور مکتوب نگار نے کی ہے۔ان کے اپنے زمانے کے لوگوں نے بھی ان کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ان کے طرز نگارش کی پیروی کر کے اپنے اسلوب میں وہ شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو غالب کا خاصہ ہے۔مگر یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ کوئی بھی غالب جیسا نہ بن پایا کہ غالب تو سب پر غالب ہیں۔وہ خود بھی سخن کے اس قافلے کے سالار اعظم ہیں اور ان کا انداز بھی سب پہ حاوی ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے بھی اس گروہ میں شامل ہونے کی کاوش کی ہے جو غالب کا مقلد بنا ہے اور میں ناچیز جو ادب کی ایک نہایت ہی ادنا سی طالب علم ہوں غالب کی پیروی کرنے

والے ڈاکٹر انور سدید کے ان تمام خطوط کا جب جائزہ لیا ہے تو میری ناقص رائے کے مطابق تو ڈاکٹر انور سدید بہت حد تک رنگ غالب کو اپنانے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔ان تمام چیزوں کو جن کو غالب نے زیر بحث لایا ہے ڈاکٹر انور سدید نے بھی ان کو ان کی تقلید میں اپنے تمام ان پندرہ خطوں میں ان موضوعات کو تقریباً سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اس کاوش میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔اس سچ کی وضاحت اور تصدیق میرے اس مقالے کے پچھلے صفحات کریں گے جن میں میں نے کوشش کی ہے کہ تمام موضوعات کو سمیٹنے کی کوشش کروں جو ان دونوں حضرات کے مکاتیب میں ہمیں مشترکہ دکھائی دیتے ہیں۔اس ضمن میں پہلے غالب کے خط کا حوالہ دیا اور پھر ڈاکٹر انور سدید کے مکتوب سے ویسی ہی ایک مثال پیش کی تاکہ اس بات کی وضاحت ہو پائے کہ ڈاکٹر انور سدید نے غالب کی پیروی کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ محض روایت کی پیروی نہیں۔ اس روایت کی جو نسل در نسل ہمارے ہر ادیب وشاعر کے ہاں پائی جاتی ہے کہ رنگ غالب کی پیروی کرنی ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے محض یہ پیروی نہیں کی بلکہ انھوں نے صحیح معنوں میں غالب سے واقفیت پیدا کی۔ان کے تمام تر کام کو سمجھا اس کو جانا اور اس کے بعد غالب کے رنگ کو اپنانے کی سعی وکاوش کی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ انور سدید نے سخن کے دربار میں پہلے غالب کے ہاں حاضری دی۔ان کی شاگردی اختیار کی ہے۔وہ تمام اسلوب جو غالب کا ہے اسے ان سے سیکھا، سمجھا اور جاننا اور اس سب کے بعد سخن کے دربار سے حضرت غالب نے سند عطا کی جس کے بعد ڈاکٹر انور سدید نے غالب کا چغہ پہنا اور اس نئے عہد میں آوارد ہوئے۔پھر انھوں نے غالب کے نئے خطوط لکھے اور ان تمام خطوط نے دنیائے ادب میں ایک تہلکہ مچا دیا۔جس نے بھی ان خطوں کو پڑھا وہ ان کی سحر انگیزی میں کھو گیا۔قریباً ہر کسی نے ہی اس بات کا اعتراف کیا کہ ڈاکٹر انور سدید نے رنگ غالب کو اپنانے کی جو سعی کی ہے وہ اس میں کامیاب ٹھہرے ہیں اور اس لہجے اور آہنگ کے ساتھ انصاف کرنے تک کافی حد تک کامران ہوں گئے ہیں جو ہمیں غالب کے ہاں ملتا ہے۔اگرچہ غالب کے انداز اور ان کے لہجے کو کلی اپنانا تو کسی کے بس کی بات نہیں ہے لیکن بہرحال غالب کے انداز کو اپنانے اور اس کی تقلید وپیروی میں انور سدید نے کمال کر دیا ہے۔

اب ذرا نظر ڈالتے ہیں ڈاکٹر انور سدید کے ان خطوط کے بارے میں مختلف تنقید نگاروں کی آرا پر جنھوں نے ڈاکٹر انور سدید کے اس کام کو بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ جیسے کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ غالب کے نئے خطوط کے ضمن میں ڈاکٹر انور سدید نے پہلے غالب سے واقفیت پیدا کی، ان کے اسلوب کو اچھی طرح سمجھا اور اس کے بعد قلم اٹھانے کی جرات کی ہے۔تب ہی ہمیں ان تمام خطوط میں رنگ غالب بہت ہی واضح انداز میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔اس بات سے واقفیت خود انور سدید کو بھی اچھی طرح تھی کہ وہ ایک بہت ہی بڑی ہستی جو ہر دور کے شاعر اور ادیب کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہے جو قافلہ سخن کا سالار اعظم ہے۔سو اس کا اظہار ڈاکٹر انور سدید نے پیش لفظ میں یوں کیا ہے:

> میں نے اس محشر خیال اور مجموعہ اضداد شخصیت کے پیشرو نقوش کو اس کتاب میں قائم رکھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔چنانچہ غالب کے نئے خطوط میں اگرچہ واقعات زمانہ کا تناظر تبدیل ہو گیا ہے لیکن ان میں آپ کو وہ غالب یقینا نظر آئے گا جس نے اپنی انا کو تحفظ دیا، دوستوں کی دلداری کی، غم مرگ، غم رزق، غم عزت اور غم فراق کو برداشت کیا۔ زندگی کی مشکلات کے آگے سینہ سپر رہا، اس کی آنکھوں میں نامساعد حالات کے باوجود شرارت کی چمک آویزاں ہے اور وہ مسکراہٹوں کی تقسیم بے دریغ کرتا ہے۔۶۲

کس قدر خوبصورت وضاحت ہے جو اوپر درج بالا پیراگراف میں ڈاکٹر انور سدید نے دی ہے اور واقعتاً ہے بھی ایسا ہی کہ ڈاکٹر انور سدید نے ان تمام تر خطوط میں غالب کی ذات کے ان تمام بنیادی امور سے ہمیں گاہے بگاہے واقف رکھا ہے جو ان کی ذات کا حسن ہیں۔ڈاکٹر انور سدید نے اس امر کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ ان تمام پندرہ خطوط میں انھوں نے واقعات کا تناظر اور پس منظر بدل کے رکھ دیا ہے مگر یہاں غالب شخصیت کے لحاظ سے بہرحال وہی اصل والا غالب ہے جو سخن وری کی دنیا کا امام وپیشوا ہے۔جس نے ہر طرح سے ہر قسم کے حالات میں اپنی انا کو محفوظ رکھا ہے۔اس کے لیے اپنی انا کو جراحت وشکست سے محفوظ رکھنا اہم ترین ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے جو غالب کا چغہ پہنا تو وہ ہو بہو وہی غالب نظر آئے،وہ انا دار اور خود دار

تھے۔ یہ وہی غالب ہے دوستی کے جذبے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا دکھائی دیتا ہے۔ جس کے نزدیک اس کے دوست احباب اس کی زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ ہیں۔ وہ ہمیں ہر حال میں دوستوں کی محبت کا دم بھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ غم وخوشی ہر طرح کے حالات میں اپنے دوستوں کی دلداری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس نئے دور کے نئے غالب کے ہاں بھی ہمیں وہی جرات وبہادری ملتی ہے جو اصل غالب کے ہاں ہے۔ یہ بھی زندگی کی ان تمام مشکلات کو برداشت کرتا ہے جو اس کے رستے میں آئی ہیں۔ وہ ان تمام نامساعد حالات کے آگے سینہ تان کر کھڑا ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے جو ان کے رستے میں رکاوٹ کھڑی کرتی ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے نئے غالب (انور سدید) ان تمام پریشانیوں کے باوجود حوصلہ نہیں ہارتے اور ان کی آنکھوں میں شرارت کی چمک بدستور قائم رہتی ہے۔ وہ ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ جس طرح سے مرزا اسد اللہ خان غالب نے آنسوؤں کے درمیان زندہ رہنے کی راہ نکال لی ہے۔ اداسی کے عالم میں ہنسا سیکھ لیا ہے اور کرب کے عالم میں مسکرانا بھی انہیں آتا ہے۔ سو ویسی ہی بلند ہمتی ہمیں آج کے اس غالب کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے جو ڈاکٹر انور سدید کے ذریعے ہم تک آیا ہے۔ دونوں کی ذات میں یہ خصوصیات جو مشترکہ ہیں وہ اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید نے غالب کے نئے خطوط میں ان تمام خصوصیات کو قائم رکھا ے اور بہت خوب قائم رکھا ہے۔

جیسے کہ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ غالب کے نئے خطوط میں ڈاکٹر انور سدید نے اظہر جاوید کو مخاطب کیا ہے اور یہ تمام پندرہ خطوط اظہر جاوید صاحب کے رسالے تخلیق کی زینت بنے ہیں۔ اظہر جاوید نے ایک دیباچہ نقش فریادی کے زیر عنوان لکھا ہے۔ یہاں زرا ان کی رائے ملاحظہ ہو جو انھوں نے ان تمام خطوط کے متعلق ہمیں فراہم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> انھوں نے غالب کے اسلوب کو نبھانے اور اپنا رنگ جمانے کی خوبصورت کوشش کی ہے اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کی نکتہ چینی کرنے اور اس میں میخ نکالنے کے باوجود تخلیق کے پڑھنے والوں نے اسے بہت پسند کیا اور انور سدید کے انداز تحریر کو سراہا۔ اگر کبھی کوئی

خط چھپنے سے رہ گیا تو دسویں سوال ہوئے، بیسوں لوگوں نے استفسار کیا یوں
انور سدید کے قلم کو توانائی ملی۔۶۳

اظہر جاوید کی تحسین بہت ہی عمدہ اور مبنی بر حقیقت ہے کہ واقعی غالب کے نئے خطوط بہت ہی کامیاب ٹھہرے ہیں اور ان کو قارئین کی بے پناہ محبت حاصل ہوئی ہے۔اظہر جاوید نے درست فرمایا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے اسلوب غالب کو جو اپنایا ہے اور جو اس کو نبھانے کی کوشش کی ہے وہ اس میں بہت زیادہ کامیاب بھی ہوئے ہیں اور ان کی اس کامیابی کی دلیل وہ تمام خطوط ہیں جو اظہر جاوید کو وقتاً فوقتاً قارئین کی جانب سے موصول ہوتے رہے ہیں۔جس کے ذریعے ہمیں تخلیق کے قارئین کی آرا موصول ہوتی رہی ہیں اور یہ آرا واضح طور پر ان تمام لوگوں کی ان خطوط میں پسندیدگی کو ظاہر کرتی ہیں ان کے داد وتحسین سے ہم ان کے ذریعے آگاہ ہوتے ہیں۔اگرچہ اس تمام محبت اور داد وتحسین کے ساتھ ساتھ ان کو نکتہ چینی کا سامنا بھی رہا ہے۔کیونکہ یہ تو ایک عام اصول ہے کہ جہاں کسی بھی تخلیق کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔وہیں اس کو اور اس کے لکھنے والے کو تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے۔سو یہی صورت حال غالب کے نئے خطوط کے ساتھ بھی جاری رہی۔کسی نے ان کو سراہا، ان کی تعریف کی تو کسی نے ان کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ان میں کیڑے نکالے۔ان کے عیب گنوانے شروع کر دیئے۔ان میں موجود غلطیوں کی نشاندہی کرنے پر اپنا سارا زور صرف کیا مگر یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ غالب کے نئے خطوط کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آیا۔بعض دفعہ بلکہ بہت دفعہ ایسا بھی ہوا کہ اگر کبھی کسی خط کے شائع ہونے میں تھوڑی تاخیر واقع ہو گئی یا اگر ان میں سے کوئی خط شائع ہونے سے رہ گیا تو قارئین کی جانب سے سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔یوں اس محبت کی بدولت ڈاکٹر انور سدید کے قلم کو مزید توانائی عطا ہوئی۔اس میں مزید نکھار آیا اور ان کو پڑھنے والوں نے اور زیادہ سراہا۔اس اصرار کی بدولت ڈاکٹر انور سدید کو حوصلہ ملا کیونکہ داد وتحسین کسی بھی کام کو ملے اس میں مزید نکھار آنا لازمی ہو جاتا ہے اور دوسرا ادیب کا مزید لکھنے کی جانب رغبت بھی ملتی ہے۔یہی سب کچھ ڈاکٹر انور سدید کے غالب کے نئے خطوط کے ضمن میں ہوا۔اظہر جاوید کا ان تمام خطوط کو اس انداز کا خراج تحسین زبردست ہے اور اس سے ان کی اہمیت واضح ہو گئی ہے۔

شبیر احمد قادری جو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے فرائض منصبی سرانجام دیتے رہے ہیں انھوں نے بھی باریک بینی سے ڈاکٹر انور سدید کے ان تمام خطوط کا جائزہ لیا ہے اور خطوط غالب کی پیروی، پیروڈی اور انور سدید کے عنوان سے ایک مضمون سہ ماہی اسالیب میں لکھا ہے جس میں انھوں نے ڈاکٹر انور سدید کی اس کاوش پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ان تمام خطوط کو ادب کے اندر ایک اہم اور خوشگوار اضافہ قرار دیا ہے۔یہاں ذرا ملاحظہ ہو وہ ان خطوط کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> میری رائے میں خطوط غالب کی پیروی یا پیروڈی کا بڑا مقصد بانداز دگر مخالفین کو سبق سکھانا، انور سدید اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ٹھہرے ہیں۔دوسری جانب سے جو ردعمل سامنے آیا وہ وقت کی دھول میں گم ہو کر رہ گیا۔مگر غالب کے نئے خطوط پیروڈی اور طنز ومزاح کا مستقبل باب بن گئی۔انور سدید کے قلم میں جو زور تھا اس کتاب کے لفظ لفظ سے جھلکتا ہے۔بات سے بات نکالنے کا ہنر انور سدید کو خوب آتا ہے اور وہ جو مکھی لڑنا بھی خوب جانتے ہیں۔۶۴

سو یہ تو ہو گئی بات ان تمام مکتوبات کے بارے میں شبیر احمد قادری کی رائے۔اس سے واضح ہوا کہ ان مکتوبات کی اہمیت کس قدر اہم ہے۔شبیر احمد قادری نے کہا کہ ان تمام مکتوبات کا بڑا مقصد ان تمام لوگوں کو سبق سکھانا تھا جو ڈاکٹر انور سدید کے مخالف تھے اور ان پر بے جا حملے کرتے تھے اور یہاں ان خطوط کا مطالعہ اور ان پر مختلف ناقدین کی آرا سے واضح ہو چلا کہ ڈاکٹر انور سدید اپنی اس کاوش میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔یہاں اس حقیقت سے بھی شبیر احمد قادری نے ہمیں آگاہ کر دیا ہے کہ انور سدید تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ان کے مخالفین کو جواب مل گیا مگر جو ریت روایت ہے جہاں بہت سے لوگوں نے ڈاکٹر انور سدید کی اس کاوش کو سراہا وہاں بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی۔مگر شبیر احمد قادری نے ڈاکٹر انور سدید کے ان تمام خطوط کے بارے میں اپنی سیر حاصل بحث میں واضح کر دیا کہ مخالفین کی یہ مخالفت تو وقت کی دھول کی مانند گم ہو کر رہ گئی اور غالب کے نئے خطوط اردو ادب میں پیروڈی اور طنز ومزاح

کے حوالے سے ایک مستقل باب بن گئے اور ڈاکٹر انور سدید کا فن اپنے پورے عروج اور آب وتاب کے ساتھ ہمیں جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اردو ادب میں ایک بڑے نامور ادیب، انشائیہ نگار اور نظم نگار کے طور پر اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔انشائیہ میں تو ڈاکٹر وزیر آغا امام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بہت زیادہ کام کیا ہے اور اس میدان میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے تعلق کی بات کی جائے تو ان کا رشتہ شاگرد اور استاد کا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید کے استاد ہیں۔پی ایچ ڈی کے مقالے کے نگران کی حیثیت سے ڈاکٹر وزیر آغا کو ڈاکٹر انور سدید کا استاد مقرر کیا گیا اور یہ رشتہ گہرا ہوتا چلا گیا۔ڈاکٹر انور سدید نے شاگرد ہونے کا حق ادا کیا۔غالب کے نئے خطوط پر جب ڈاکٹر وزیر آغا نے تبصرہ کیا تو اس میں انھوں نے بہت ہی عمدہ انداز میں ڈاکٹر انور سدید کو اس کاوش پر سراہا ہے۔جب آپ کو ڈاکٹر انور سدید کا غالب کے نئے خطوط کا مسودہ ملا تو آپ نے اس کے پڑھنے کے بعد اس کے جواب کے طور پر ڈاکٹر انور سدید کو ایک خط لکھا جس نے انھوں نے تفصیلاً ان کو ان تمام خطوط کے بارے میں اپنی آرا سے آگاہ کیا ہے۔ذرا ملاحظہ ہو وہ کیا فرماتے ہیں:

> ان دنوں اوراق کے سلسلے میں بے حد مصروف ہوں۔کل کچھ فرصت ملی تو سوچا کہ آپ کا بھیجا ہوا غالب کے نئے خطوط کا مسودہ ذرا الٹ پلٹ کر دیکھوں۔بس اتنا یاد ہے کہ میں نے غالب کے پہلے خط کا پہلا ورق پڑھنے کی کوشش کی تھی، اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہوا۔دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص میرے شانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے محویت کے عالم سے نکال رہا ہے۔جھنجھوڑنے والے نے بتایا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے مجھے کتاب کے سحر سے باہر نکالنے میں مصروف ہے۔بہرحال اس وقت تک میں پوری کتاب پڑھ چکا تھا۔۶۵

واہ! واہ! کیا عمدہ انداز بیان ہے۔میرے خیال میں تو ڈاکٹر وزیر آغا کی طرف سے اتنی پذیرائی مل جانا غالب کے نئے خطوط کے کامیاب ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔یوں اتنی مصروفیت میں بھی ڈاکٹر وزیر آغا نے فرصت کے چند لمحے نکالے اور محض اس کتاب کے اوراق

کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کا ارادہ کیا مگر پھر دیکھئے کہ خود ہی کہتے ہیں کہ میں نے محض پہلا ورق پڑھا اور اس سے آگے کی کہانی مجھے یاد نہ رہی کہ میں ان خطوط کے سحر میں اس قدر بری طرح سے گرفتار ہوا کہ مجھے اندازہ ہی نہ ہوا کہ میں کہاں ہوں اور کس جگہ ہوں اور کیا پڑھ رہا ہوں۔ محویت کا عالم اس قدر تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے گردوپیش سے مکمل غافل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ میں اسی بے خودی کے عالم میں تھا کہ یکم دم مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے شانوں کو ہلا کر مجھے اس محویت کے عالم سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا ہے کیونکہ کھانا میرے انتظار میں پڑے پڑے ٹھنڈا ہو چکا ہے اور کندھا ہلانے والے نے مجھے بے خودی سے باہر نکالنے کی یہ کوشش تقریباً آدھے گھنٹے سے جاری رکھی ہے۔ یوں ڈاکٹر وزیر آغا کا اس قدر محویت سے ڈاکٹر انور سدید کے ان تمام خطوط کا مطالعہ کرنا واضح ثبوت ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اپنی اس کاوش میں کامیاب ٹھہرے ہیں کیونکہ جب کوئی تحریر قاری کی پوری توجہ حاصل کر کے اس کو خود میں گم کر کے دنیا ومافیہا سے بے خبر کر دے تو یہ اس تحریر کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے اور یہاں یہ بات ثابت ہوئی کہ غالب کے نئے خطوط پڑھنے والے کو خود میں گم کر دینے کی صلاحیت لیے ہوئے ہیں۔ اس قدر سحر انگیز ہیں کہ کوئی بھی آدمی جیسے ادب کا ذوق وشوق ہو وہ ایک ہی نشست میں ان تمام پندرہ خطوط کو پڑھ سکتا ہے جیسے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے آدھے گھنٹے کی محویت اور دلچسپی سے ان خطوط کو پڑھ دیا۔ یہاں آگے دیکھیں اس خط کے اختتام میں وہ کیا کہتے ہیں:

> میں نجومی تو نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ کتاب بہت پسند کی جائے گی۔ ممکن ہے آپ کی اور میری زندگی میں ایسا نہ ہو۔ کیونکہ اس میں بہت سے معاصرین زد میں آئے ہیں لیکن اس کے بعد یقینی طور پر ہمارے ہاں چھوٹی چھوٹی تحریفیں تو لکھی گئی ہیں، کتاب سائز کی یہ غالباً پہلی پیروڈی (تحریف) ہے۔٦٦

یہاں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید کے ان خطوط کے بارے میں ایک طرح کی پیش گوئی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں اگرچہ یہ کسی نجومی کی پیش گوئی کی مانند تو نہیں کہ میں کوئی نجومی تو ہوں نہیں مگر یہ محض میرا خیال ہے ڈاکٹر وزیر آغا نے خود تو اس کتاب کو سراہا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ تمام خطوط بہت زیادہ پسند کیے جائیں

گے۔کیونکہ لوگ ان کو پڑھیں گے سراہیں گے، اس کے ساتھ انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ اگرچہ ان تمام خطوط کو ابھی ان کی اور ڈاکٹر انور سدید کی زندگی میں اتنی پذیرائی نہیں ملے گی کیونکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غالب کے نئے خطوط میں اس عہد کے بہت سے نامور لوگوں کو ڈاکٹر انور سدید نے کڑے ہاتھوں لیا ہے اور ان پر طنز کے نشتر برسائے ہیں۔اس لیے اس عہد میں تو شاید وہ پذیرائی ان کے حصے میں نہ آئے جو ان کا مقصد ہے مگر یہ امر لازم ہے کہ آنے والے وقت میں ان خطوط کے قارئین بڑھتے جائیں گے اور ادب سے وابستہ اور ادب سمجھنے والے عمدہ ذوق رکھنے والے لوگ غالب کے نئے خطوط کو سراہیں گے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کے نئے خطوط کو کتاب سائز کی پہلی پیروڈی قرار دیا ہے۔اس سے قبل اگرچہ پیروڈی ہے مگر چھوٹی چھوٹی تحریفوں کی صورت میں کتاب سائز کی پہلی پیروڈی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی طرف سے یہ پذیرائی غالب کے نئے خطوط کی کامیابی پہ میر تصدیق ثبت کرتی ہے۔

مشفق خواجہ اردو مزاح نگاری کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔مزاح کے میدان میں انھوں نے بہت ہی شاہکار تخلیقات منظر عام پر لائی ہیں جو ان کو اس شعبے میں امر کر گئی ہیں۔مشفق خواجہ بھی ڈاکٹر انور سدید کے ہم عصر ہی ہیں اور دونوں میں روابط بھی اچھے تھے۔غالب کے نئے خطوط کے مطالعے کے بعد مشفق خواجہ کی رائے ملاحظہ ہو:

> تنقید، تحقیق، انشائیہ، طنز ومزاح، یہاں تک کہ شاعری بھی۔ آخر کون سی صنف ادب ہے جس میں ڈاکٹر انور سدید کے کمالات کا اظہار نہ ہوا ہو۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ انور سدید ایک فرد کا نام نہیں بلکہ کئی افراد کا مجموعی نام ہے جو ادب کے الگ الگ شعبوں میں سرگرم ہے اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ یہ کتاب جو اس وقت آپ کے سامنے ہے ادبی طنز ومزاح کا بہترین نمونہ ہے۔میں نے ادبی طنز ومزاح اس لیے کہا ہے کہ اس کتاب کا سارا مواد ادبی مسائل ومعاملات سے تعلق رکھتا ہے۔اسے ادبی ڈائری بھی کہا جا سکتا ہے۔۶۷

مشفق خواجہ نے یہ خراج تحسین ''کچھ اس کتاب کے بارے میں'' کے زیر عنوان ایک مضمون میں پیش کیا ہے۔انھوں نے ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت اور ان کے کمالات کے بارے

میں اظہار خیال کیا ہے اور انھوں نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید محض ایک فرد کا نام نہیں ہے بلکہ کئی افراد کے مجموعے کا ایک مجموعی نام ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب بیک وقت ادب کے بہت سارے شعبوں میں کام کر رہے ہیں اور یہ کام وہ بہت ہی عمدہ طریقے سے سرانجام دے رہے ہیں۔ تنقید کے میدان میں وہ کام کر رہے ہیں۔ تحقیق کے شعبے میں ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔ انشائیہ کا میدان ان سے خالی نہیں ہے۔ طنز ومزاح میں انھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ شاعری میں بھی انھوں نے کچھ طبع آزمائی کی ہے۔ غرض ڈاکٹر انور سدید نے کسی بھی شعبہ ادب کو نہیں چھوڑا جس میں اپنے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ آگے چل کر خواجہ صاحب مزید کہتے ہیں کہ ''غالب کے نئے خطوط'' ادبی طنز ومزاح کا بہترین نمونہ ہے کیونکہ اس کتاب میں جتنا بھی مواد دیا گیا ہے وہ ان ہی مسائل ومعاملات سے تعلق رکھتا ہے جو خالص ادبی ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کو ادبی طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ ادبی ڈائری کے نام سے بھی پکارا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

> انور سدید نے اظہار ومطالب کے لیے غالب کے خطوط کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ غالب کے انداز کو اختیار کرنے میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئے ہیں کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ماہرین غالبیات ان خطوں کو اصلی سمجھ کر غالب پر مزید تحقیق کا آغاز نہ کر دیں۔ ۶۸

اللہ اکبر! مشفق خواجہ نے تو بات ہی ختم کر دی۔ انھوں نے تو ان خطوں کو ہو بہو غالب کے خطوط ہی قرار دے دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید نے اظہار مطالب کے لیے جو پیرائیہ اختیار کیا ہے وہ غالب کے خطوط کا ہے۔ انھوں نے رنگ غالب کو اپنایا اور بقول مشفق خواجہ وہ اس رنگ کو اپنانے میں اس حد تک کامیاب رہے ہیں کہ ان کو تو خطرہ ہی پڑ گیا ہے کہ کہیں ماہرین غالبیات ان تمام خطوط کو اصلی سمجھ کر غالب پر مزید تحقیق کا آغاز نہ کر دیں۔ مشفق خواجہ کی طرف سے غالب کے نئے خطوط اور ان کے مصنف ڈاکٹر انور سدید کے لیے اس قدر پسندیدگی اور حوصلہ افزائی ان کی کامیابی کی ایک اور دلیل ہے۔

کرنل محمد خان، دنیائے ادب کا ایک ایسا بڑا نام جو کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ کچھ لوگوں کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ان کا نام ہی ان کے تعارف اور پہچان کے لیے کافی ہوتا ہے۔کرنل محمد خان بلاوجہ ایک ایسی ہی ادبی شخصیت ہیں کہ جن کی ذات میں بے پناہ خوبیاں ہیں۔ہر خوبی اپنی جگہ دوسری سے بڑھ کر ہے۔کرنل محمد خان کا شگفتہ پیرائے اظہار ان کو منفرد حیثیت دیتا ہے۔اب ذرا ملاحظہ ہو کہ جب ان کی تنقیدی نظر ڈاکٹر انور سدید کے غالب کے نئے خطوط پر پڑی تو ان کے دادنے سب کو چونکا دیا۔یہاں بھی انھوں نے اپنے نرالے اور اچھوتے انداز سے ڈاکٹر انور سدید کو داد و تحسین دی ہے۔انھوں نے غالب کے نام ایک خط لکھ مارا جو کہ پھر غالب کے نئے خطوط میں شامل بھی کیا گیا ہے۔اس کتاب کے آخر میں کرنل محمد خان کا خط چچا غالب کے نام کے نام سے شائع ہوا۔اس خط کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

غالب چچا!

> آداب ایک مہدس، کہ نام اس نیک بخت کا انور سدید ہے۔تمہارے نام سے لوگوں کو خط لکھ رہا ہے۔ہو بہو، جیسے تم اپنے دوستوں کو لکھا کرتے تھے، لکھتا کیا ہے، مکتوب الیہ کے ساتھ بالکل تمہاری طرح باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔پھر وہی آداب استعمال کرتا ہے جیسے تمہارے خطوں میں ہیں، وہی روز مرہ، وہی شوخیاں۔
>
> چچا اس شخص انور سدید کی مشابہت۔ چہرے کی نہیں، تحریر کی۔تم سے اس قدر مکمل ہے کہ اس کا کوئی خط پڑھ لو تمہیں شبہ ہو گا یہ تو میں نے لکھا ہے۔بلکہ سچی بات ہے چچا، اس کے بعض خطوط تو اس قدر شوخ اور دلربا ہیں کہ خود تمہیں پڑھ کر فخر محسوس ہو گا۔۶۹

میرے خیال میں ڈاکٹر انور سدید کو ان تمام خطوط پر سب نے ہی اپنے اپنے انداز میں داد دی ہے اور ہر کسی نے ان کو بے تحاشہ سراہا ہے مگر یہاں کرنل محمد خان نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔انھوں نے اپنے بہت ہی شگفتہ پیرائے میں ڈاکٹر انور سدید کے خطوط پر تبصرہ کیا ہے اور تبصرہ اس طرح کیا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید سے بات نہیں کی ہے بلکہ براہ راست حضرت غالب سے خط وکتابت کی ہے اور اس میں ان کو خبر دی ہے کہ ایک انور سدید نام کا بندہ ہے جو آپ کا

ہی نام اختیار کر کے لوگوں کو خط لکھتا ہے۔اس پیرائیہ اظہار بیان وہی ہے جو کہ آپ کا ہے اور اسی طرح لوگوں کو خط لکھتا ہے جیسے کہ آپ لکھتے تھے بلکہ لکھنا ہی صرف نہیں ہے بلکہ مکتوب الیہ کے ساتھ ویسے ہی باتیں کر سکتا ہے جیسے آپ کرتے تھے۔کرنل محمد خان نے بجا فرمایا کہ اسی باب میں میں نے جہاں ڈاکٹر انور سدید اور غالب کے خطوط کا جائزہ لیا ہے وہاں میں نے مثالیں دے کر اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے نئے دور کے غالب کا پیرائیہ اظہار غالب سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ان کی باتیں کرنے کا انداز ہو بہو غالب کے جیسا ہی ہے۔انھوں نے جو آداب والقاب لائے ہیں وہ بھی ویسے ہی ہیں جیسے ہمیں حضرت غالب کے ہاں ملتے ہیں۔ ان ہی باتوں اور چیزوں کی طرف کرنل محمد خان اپنے اس غالب کے نام خط میں کر رہے ہیں۔ان تمام چیزوں کی وضاحت کرنے کے بعد کرنل محمد خان کہتے ہیں کہ اگرچہ چہرے کی مشابہت تو ڈاکٹر انور سدید کی غالب کے ساتھ نہیں ہے مگر ان کی تحریر کی مشابہت اس قدر زیادہ ہے کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ خط اصل میں لکھا ہی خود غالب نے ہے۔تھوڑا اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور غالب کو خبر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید نے یہ خطوط اس قدر شوخ اور دلربا لکھے ہیں کہ خود آپ کو بھی پڑھ کر بہت ہی فخر ہو گا کہ یہ خطوط اس قدر خوبصورت ہیں۔اب ذرا اس خط کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

> چچا۔تمہارے جانے کے بعد اردو شعر وادب میں بے مثال ترقی ہوئی ہے۔ لیکن شاعری میں تمہارے رنگ کو آج تک کوئی نہیں پہنچا۔تمہاری نثر بھی آج تک ناقابل تقلید تھی لیکن انور سدید کی کوشش کے بعد اب یہ قسم نہیں کھائی جاتی۔ سمجھ نہیں آتی چچا، کہ اس کارنامے پر شاباش تمہیں دینا چاہیے یا انور سدید کو۔بے شک تم استاد ہو اور انور سدید تمہارا پیرو، مگر شاباش کے مستحق تم دونوں برابر کے نظر آتے ہو۔۷۰

یہاں تو کرنل محمد خان نے بات ختم ہی کر دی اور ڈاکٹر انور سدید کو غالب کا پیرو قرار دے کر ان کو شاباش کا حق دار قرار دیا ہے۔یہاں تو انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے حضرت غالب کی شاعری میں تو اگرچہ آج تک ان کے رنگ کو کوئی بھی نہ پہنچ پایا ہے اور نثر کے میدان میں بھی وہ ناقابل تقلید ہی ٹھہرے ہیں مگر اب ڈاکٹر انور سدید کے بعد ان کی اس

کوشش کی وجہ سے یہ قسم نہیں کھائی جا سکتی کہ اب غالب ناقابل تقلید ہے۔میرے خیال میں تو یہاں کرنل محمد خان نے تعریف کرنے کا حق ادا کر دیا ہے کہ اس سے بہترین تعریف اور کی نہیں جا سکتی ہے۔یوں کرنل محمد خان کا یہ خط غالب کے نام ڈاکٹر انور سدید کے غالب کے نئے خطوط پر ایک عمدہ ترین تبصرہ ہے۔

اب یہاں ذرا علی گڑھ سے شہر رسول کی رائے ملاحظہ ہو جو کہ تخلیق کے ایک اچھے قاری ہیں۔وہ محترمہ عذرا اصغر صاحبہ کے نام خط لکھتے ہیں جس میں وہ ڈاکٹر انور سدید کو ان کے خطوط پہ داد دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ذرا ملاحظہ ہو:

> ڈاکٹر انور سدید کا غالب کا خط اس بار ہی خوب ہے۔غالب کا خط سے متعلق
> خسروی کا خط کسی دودھ کے جلے ہوئے کا خط معلوم ہوتا ہے۔۱۷

قارئین بھی برابر ان تمام تر خطوں کو پسند فرماتے رہے جو ڈاکٹر انور سدید کو خراج تحسین پیش کرتے رہے۔شبیر رسول ادب کے اچھے قاری ہونے کے ساتھ ساتھ خود ایک بہت اچھے ادیب بھی ہیں، یہاں انھوں نے ڈاکٹر انور سدید کو سراہا ہے اور ان کے خط کو پسند کیا ہے اور ساتھ ہی ''خسروی'' کو بھی کڑے ہاتھوں لیا ہے جنھوں نے بارہا غالب کے نئے خطوط پر طنز کے نشتر برسائے ہیں۔یہ تو ویسے بھی زمانے کے عام قانون رہا ہے کہ جب بھی کوئی چیز تخلیق کے مراحل سے گزر کر سامنے آتی ہے تو اس پر رائے دینے والے دو طرح کے گروہ بن جاتے ہیں۔ایک وہ جو اس کی مخالفت کرتا ہے۔اس میں کیڑے نکالتا ہے۔ادیب کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔اس پر طنز کے نشتر برساتا ہے۔اس کو محض غلطیوں سے مطلب ہوتا ہے اور وہ کمزوریوں کی نشاندہی پر ہی ساری توجہ مرکوز رکھتا ہے۔اس باب کے پچھلے صفحات میں خاکسار نے اس گروہ کے لوگوں کی آرا کو سامنے لایا اور ان پر تبصرہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔جنھوں نے ڈاکٹر انور سدید کے اس کام کو بے حد سراہا ہے اور تقلید غالب کرنے میں ان کو کامیاب ٹھہرایا ہے۔اس سلسلے میں میں نے اظہر جاوید، شبیر احمد قادری، ڈاکٹر وزیر آغا، مشفق خواجہ، کرنل محمد خان جیسے نامور اہل قلم کے تجزیئے یہاں شامل کر کے بات کی وضاحت کی ہے۔ان سب سراہنے والوں کے ساتھ ہی چند گنتی کے لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ڈاکٹر انور سدید اور غالب کے نئے خطوط پر تنقید کی

ہے۔اس سلسلے میں ایک بہت ہی اہم نامہ ''خسروی'' کا ہے۔انھوں نے غالب کے نئے خطوط کے ضمن میں ڈاکٹر انور سدید پر بہت زیادہ تنقید کی ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے تخلیق کی مدیرہ کے نام جو خط لکھا ہے اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

> انور سدیداب بور کرنے لگے ہیں۔ دو غالب کے خط تو ٹھیک چلے۔ اب تو آورد ہے اور وہ بھی محض زبردستی کی۔اس انداز اور اسٹائل کی نقل کہاں تک کر سکتے؟ ہاں اگر یہ مقصد ہے کہ غالب کی مد دسے کچھ لوگوں کی مدح سرائی اور کچھ کی ہجو کی جائے تو یہ تو حاصل ہو ہی رہا ہے۔غالباً آپ بھی اسے یوں قبول کر لیتی ہیں کہ مدح سرائی تو آپ کی بھی ہو جاتی ہے اور اب کی دفعہ تو آپ کے صاحب کی بھی ہو گئی۔۲۷

خسروی نے جہاں ڈاکٹر انور سدید پر کڑی تنقید کی ہے وہاں ہی انھوں نے ساتھ ہی محترمہ عذرا اصغر صاحبہ کو بھی کڑے ہاتھوں لیا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید غالب کے انداز اور رنگ کو اپنا نہیں پائے اور نہ ہی یہ ان کے بس کا کام ہے کہ غالب کے انداز اور اسٹائل کی نقل کہاں تک کر سکتے ہیں۔بس محض دو ہی خط ایسے تھے کہ جن کو سراہا ہے۔خسروی نے انھوں نے عذرا اصغر صاحبہ کو کہا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کا مقصد محض کچھ لوگوں کی تعریف کرنا ہے اور ساتھ ہی کچھ لوگوں کی ہجو کرنی ہے تو یہ مقصد ہر حال پورا ہی ہو رہا ہے اور عذرا اصغر بھی ان تمام خطوط کو اس لیے اپنے رسالے میں جگہ دے دیتی ہیں کہ ان خطوط میں عذرا اصغر کی بھی تعریف ہوتی ہے اور مزید خسروی نے عذرا اصغر پر تنقید کی ہے کہ اب کی بار جو خط شائع ہوا ہے اس میں عذرا اصغر کے صاحب کی بھی مدح سرائی ہو گئی ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ خسروی محض ڈاکٹر انور سدید اور غالب کے نئے خطوط کو ہی تنقید کا نشانہ نہیں بنا رہے بلکہ اس کے ساتھ ہی مدیران تخلیق کو بھی کڑے ہاتھوں سے نشانہ طنز بناتے دکھائی دیتے ہیں۔یہاں ان کی تنقید ذاتی تنقید کے ضمن میں بھی شمار کی جا سکتی ہے۔اب ذرا اسی خط کا اگلا حصہ ملاحظہ ہو:

> بھلا آپ ہی دیکھئے کہ بچارے مرزا صاحب نے کبھی کسی کو جانا، عالی شانا، قسم کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے یا خود کو غالب علی شاہ لکھا ہے۔پھر یہ کہ یہ خط عالم بالا سے لکھا ہے تو وہاں سے اپنی مرگ کا طالب کون لکھے

گا؟ ہاں کافروں اور مشرکوں کو موت کی آرزو ضرور ہو گی لیکن مر نہ سکیں گے۔ بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ انور سدید اس میدان کے مرد نہیں ہیں۔ ان کی اپنی جولان گاہ الگ ہے اسے کیوں چھوڑتے ہیں؟ ٹھوس علمی مقالات اور نقد ونظر لکھنے والے اس قسم کی تحریریں لکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ راستہ بھٹک کر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔اب آپ اپنے احمد ندیم قاسمی صاحب کو دیکھے کہ وہ جو فکاہی کالم جنگ میں لکھتے ہیں وہاں کے اصل رنگ سے کتنا پست ہوتا ہے۔۷۳

یہاں تو خسروی نے حد ہی کر دی ہے۔انھوں نے توڈاکٹر انور سدید کو صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے سو وہ اس کو ترک کر دیں تو بہتر ہے۔کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں ہیں۔ان کا ایک الگ سے میدان ہے وہ اس کو مت چھوڑیں کہ ٹھوس علمی مقالات لکھنے والے اس طرح کے غیر سنجیدہ موضوعات بھی لکھیں تو وہ رعب ودبدبہ قائم نہیں رہتا جوان کا ہوتا ہے۔یہی حال ان کے بقول ڈاکٹر انور سدید کا بھی ہوا ہے کہ یوں لگا وہ رستہ بھٹک گئے ہیں اور ٹامک ٹوئیاں مارنا شروع کر دیا ہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے نامور ادیب اور شاعر احمد ندیم قاسمی صاحب کی مثال بھی دی ہے کہ وہ جب جنگ میں فکاہی کالم لکھتے ہیں تو وہ ایک اصل رنگ سے ہٹ جاتے ہیں یوں خسروی نے ڈاکٹر انور سدید اور غالب کے نئے خطوط دونوں کو ہی اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔خسروی نے ڈاکٹر انور سدید کے القابات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور انھوں نے واضح کیا کہ مرزا غالب نے کسی کو جانا، عالی شانا وغیرہ کے الفاظ والقاب سے مخاطب نہیں کیا ہے اور نہ ہی خود کو غالب علی شاہ پکارا ہے۔یوں انھوں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ غالب کے نئے خطوط میں القاب وآداب کے ضمن میں بھی ڈاکٹر انور سدید وہ القاب وآداب نہیں برت پائے جو غالب نے اپنے خطوط میں لائے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے خط کے اختتامیہ میں بھی ڈاکٹر انور سدید کی جانب سے لائے جانے والے لفظ اپنی مرگ کا طالب جیسے لفظ پر طنز کیا ہے اور اسے غیر ضروری قرار دیا ہے۔خسروی کی تنقید کہیں غیر ضروری بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔اب خسروی کو جواب خود ڈاکٹر انور سدید نے دیا ہے۔

تخلیق میں مدیران کے نام ایک خط میں ڈاکٹر انور سدید نے خسروی کی تنقید کا جواب دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> آپ کے نیاز کیش خسروی نے اس سلسلے کو پسند نہیں فرمایا اور لکھا ہے انور سدید اب بور کرنے لگے ہیں۔ میں نے ان کی آواز زیادہ غور سے سنی اور ان کا زیادہ شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہ صرف اختلاف رائے کا اظہار کیا بلکہ اس کو تخلیق میں آپ نے برملا شائع بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ خسروی صاحب کی بوریت تو شاید میں دور نہ کر سکوں اور ہر قاری کی بوریت کو دو رکرنے کا کوئی بھی ادیب دعوی نہیں کر سکتا تاہم میں نے کوشش ضرور کی ہے کہ غالب کے نئے خطوط میں غالب کے مزاج اور اس کے اسلوب انشاء کو برقرار رکھ سکوں۔ ۴۷

کیا خوب ہی ادبی رنگ میں ڈوبا جواب دیا ہے ڈاکٹر انور سدید نے خسروی صاحب کو نہایت ہی تحمل سے بہت ہی شگفتہ پیرائے میں۔ خسروی صاحب کے شکر گزار ہوئے ہیں کہ انھوں نے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے اور ان کو آگاہ کیا ہے کیونکہ ایک اچھے ادیب کے ہاں اختلاف رائے کا احترام پایا جاتا ہے اور یہ ہی ڈاکٹر انور سدید نے بھی کیا ہے۔ ویسے بھی ادب کے سدھار کے لیے تنقید بہت ضروری ہوتی ہے۔ مثبت اور منفی دونوں ہی ادب کو بہتر بنانے میں معاونت کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید نے خسروی صاحب کی اس بات کا کہ انور سدید بور کرنے لگے ہیں بڑا ہی خوبصورت جواب دیا ہے کہ ہر قاری کی بوریت دور کرنا میرے بس کا کام نہیں ہے اور انور سدید نے ٹھیک ہی کیا ہے کہ ہر قاری مختلف مزاج اور سوچ کا ہوتا ہے اور ہر قاری کی سوچ کے مطابق ادیب نہیں لکھ پاتا جہاں سراہنے والے ہوتے ہیں وہاں چند اختلاف کرنے والے بھی ہوتے ہیں۔ سو انور سدید نے خسروی کا بہترین جواب دیا ہے کہ میری کوشش ہے کہ میں اسلوب غالب کو برقرار رکھ سکوں۔ آگے ذرا دیکھیے خسروی کو مزید وضاحت کرتے ہیں:

> چنانچہ میں نے آج تک جو خطوط تالیف کیے ہیں ان کا بیشتر حصہ غالب سے ہی استفادہ ہے اور میں نے ضرورت تازہ کے لیے ان کی ترتیب یا مقام

ظہور بدلنے کی جسارت کی ہے، خسروی صاحب اگر واقعی بور ہو گئے ہیں تو
یہ بوریت خود غالب کی ہے لہٰذا ان کو اپنا شکوہ غالب سے کرنا چاہیے۔۷۵

اس جگہ ڈاکٹر انور سدید کا خسروی کو جواب بہت ہی مدلل اور واضح ہے۔انھوں نے بڑی ہی خوبصورتی سے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ انھوں نے غالب کے نئے خطوط کے متعلق استفادہ خود غالب سے ہی کیا ہے۔میں نے صرف ان کی ترتیب یا مقام ظہور بدلنے کی جسارت کی ہے اور ان کے تمام خطوط کے بارے میں زیادہ مواد خود غالب سے ہی حاصل کیا ہے۔اگر خسروی صاحب میرے ان خطوط کے مطالعے سے بور ہو گئے ہیں تو اس میں میرا قصور نہیں ہے۔بلکہ اصل بوریت خود غالب کی ہے۔لہٰذا ان حضرت کو اپنا شکوہ بھی میرے بجائے خود غالب سے کرنا چاہیے۔یوں ڈاکٹر انور سدید نے خسروی کو ان کے شکوے کا جواب بڑا ہی عمدہ دیا ہے۔

اس باب ''تقلید غالب اور ڈاکٹر انورسدید'' کے زیر عنوان سے ہم نے ڈاکٹر انور سدید کے ان تمام پندرہ خطوط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے انور سدید نے رنگ غالب کی پیروی کرنے کی کماحقہ کوشش کی ہے۔اس باب میں ڈاکٹر انور سدید نے غالب کی پیروی کی ہے۔وہی انداز اپنایا ہے جو غالب کا ہے۔میں نے اس باب میں دونوں کے خطوط کے درمیان مشترک عناصر کا جائزہ لینے کی کوشش ہے وہی انداز اپنایا ہے جو غالب کا ہے۔میں نے اس باب میں دونوں کے خطوط کے درمیان مشترک عناصر کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔بہت حد تک ہم اس تمام جائزے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ ٹھہرے ہیں۔اس کے علاوہ اسی باب میں غالب کے نئے خطوط کے بارے میں ناقدین کی آرا بھی پیش کی ہے کہ انھوں نے غالب کے نئے خطوط کے بارے میں کیا کہا اور کس طرح ان تمام خطوط کے بارے میں اپنی رائے دی ہے۔کم وبیش ہر ہی ادیب نے ڈاکٹر انور سدید کی اس کاوش کو سراہا اور ان کو کامیاب قرار دیا ہے۔سب نے ہی اپنے اپنے انداز میں غالب کے نئے خطوط اور ڈاکٹر انور سدید میں ڈاکٹر انور سدید کو کامیاب کہا ہے۔سب نے رنگ غالب کی پیروی کرنے والوں میں ڈاکٹر انور سدید کو انتہائی کامیاب ٹھہرایا ہے۔یوں تقلید غالب اور ڈاکٹر انور سدید میں مرزا غالب اور نئے دور کے غالب دونوں کے رنگ، آہنگ اور انداز پر تبصرہ کرنے کی اپنی سی کاوش کی ہے اور میں اس کاوش میں کس حد تک کامیاب رہی اس کا فیصلہ ادب کے قاری کریں گے۔

حوالہ جات

۱۔ مرزا اسد اللہ خان غالب، مکتوب، بنام مہر گوپال تفتہ، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد اول، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۴

۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۲۳

۳۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۰۵

۴۔ ایضاً، ص ۴۹۹

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۳۳

۶۔ ایضاً، ص ۲۸

۷۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام ہرگوپال تفتہ، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد اول، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۸

۸۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ۷۹۲

۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۴۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۱۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام ہرگوپال تفتہ، مشمولہ: اردوءے معلی، جلد اول، مرتبہ سید مرتضی حسین فاصل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳۹

۱۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نءے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۵۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام شیوناراٰین آرام، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۱۰۷۹

۱۶۔ ایضاً، ص۱۰۶۶

۱۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص۱۲۹

۱۸۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے بہتر خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر انوار احمد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۸۶

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص۱۲۸

۲۰۔ ایضاً، ص۷۷

۲۱۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام ہرگوپال تفتہ، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص۲۴۵

۲۲۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، ن ء ی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص۷۹۷ تا۷۹۸

۲۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص۱۴

۲۴۔ ایضاً، ص۲۰

۲۵۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے بہتر خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر انوار احمد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۹۹

۲۶۔ ایضاً، ص۱۰۷

۲۷۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتبو، بنام شیوناراٰین آرام، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد سوم، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص۱۰۷۱

۲۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص۴۷

۲۹۔ ایضاً، ص۴۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۵۰

۳۱۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۹۷

۳۲۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتبو، بنام شیو نارائن آرام، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد سوم، مرتبہ خلیق انجم، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۴۹

۳۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۶

۳۵۔ اسد اللہ خان غالب، مکتوب، بنام میر مہدی حسن مجروح، مشمولہ: غالب کے بہتر خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر انوار احمد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۴

۳۶۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۴۹۳

۳۷۔ اسد اللہ خان غالب، مکتوب، بنام میر مہدی حسن مجروح، مشمولہ: غالب کے بہتر خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر انوار احمد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۹۴

۳۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۶

۳۹۔ ایضاً، ص ۵۶

۴۰۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام ہرگوپال تفتہ، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد اول، مرتبہ خلیق انجم، ص ۳۸۴

۴۱۔ اسد اللہ خان غالب، مکتوب، بنام میر مہدی حسن مجروح، مشمولہ: غالب کے بہتر خطوط، مرتبہ: ڈاکٹر انوار احمد، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۹۰

۴۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۹۹

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۴۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام شیوناراٰن آرام، مشمولہ: غالب کے خطوط جلد سوم، مرتبہ خلیق انجم، ص ۱۰۵۲

۴۵۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوبہ، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے بَہتر خطوط، مرتبہ ڈاکٹر انوار احمد، ص ۱۰۹

۴۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۰

۴۷۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ: خلیق انجم، ص ۴۹۲

۴۸۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے بَہتر خطوط، مرت ڈاکٹر انوار احمد، ص ۱۰۱

۴۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، ص ۱۲۷

۵۰۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے بَہتر خطوط، مرتب ڈاکٹر انوار احمد، ص ۹۳

۵۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، ص ۲۲

۵۲۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے بہتر خطوط، مرتب: ڈاکٹر انوار احمد، ص ۹۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۵۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، ص ۲۹

۵۵۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ص ۵۰۰

۵۶۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب، بنام میر مہدی مجروح، مشمولہ: غالب کے بَہتر خطوط، مرتب ڈاکٹر انوار احمد، ص ۸۸

۵۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، ص۹۸

۵۸۔ اسد اللہ خان، غالب، مکتوب بنام ہر گوپال تفتہ، مشمولہ: غالب کے بہتر خطوط، مرتب ڈاکٹر انوار احمد، ص۹۲

۵۹۔ اسد اللہ خان غالب، مکتوب، بنام ہر گوپال تفتہ، مشمولہ: غالب کے خطوط، جلد اوّل، مرتبہ: خلیق انجم، ص۳۷۸

۶۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نءے خطوط، ص۱۲۸

۶۱۔ ایضاً، ص۱۱۶

۶۲۔ ایضاً، ص۱۱

۶۳۔ ایضاً، ص۸

۶۴۔ شبیر احمد قادری، (مضمون) خطوط غالب، پیروی۔ پیروڈی اور انور سدید، مشمولہ: اسالیب، سہ ماہی، سرگودھا، شمارہ ۲۳، ۲۰۱۶ء، ص۱۳

۶۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، مکتوب، بنام انور سدید، مشمولہ: غالب کے نءے خطوط، ص سرورق

۶۶۔ ایضاً

۶۷۔ مشفق خواجہ، مضمون، کچھ اس کتاب کے بارے میں، مشمولہ: غالب کے نئے خطوط، ص سرورق

۶۸۔ ایضاً، سرورق

۶۹۔ محمد خان، کرنل، مکتوب، بنام چچا غالب، مشمولہ: غالب کے نئے خطوط، ص۱۳۷

۷۰۔ ایضاً، ص۱۳۷

۷۱۔ شہپر رسول، انجمن خیال، مکتوب، مطبوعہ، ماہنامہ تخلیق، لاہور، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۱۱، ۱۹۸۰ء، ص۱۳۳

۷۲۔ خسروی، انجمن خیال، مکتوب، مطبوعہ، ماہنامہ تخلیق، شمارہ ۷۔۸، جلد ۱۱، ۱۹۸۰ء، ص۱۱۵

۷۳۔ ایضاً، ص۱۱۶

۷۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، انجمن خیال، مکتوب، مطبوعہ ماہنامہ تخلیق، شمارہ ۱۱۔۱۲، جلد ۱۱، ۱۹۸۰ء، ص۱۲۸

۷۵۔ ایضاً، ص۱۲۹

باب چہارم

مجموعی جائزہ، نتائج، سفارشات

مجموعی جائزہ:

ادب کی تعریف ایک مشکل ترین امر ہو گا لیکن اس کے باوجود تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ ادب ایک ایسا علم ہے جس میں انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی جائے۔ادب کو مختلف اصناف میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں بنیادی اصناف نظم اور نثر کی ہیں۔

مکتوب نگاری نثر کی ذیلی صنف ہے۔اگرچہ اس پر ہمارے ادیب اور نقاد متفق نہیں ہو سکے۔مکتوب نگاری کو ادب کی اصناف میں شامل کیا جانا چاہیے یا نہیں۔تاہم اس کے باوجود ادیبوں کی قلم سے نکلے مکتوبات کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے کیونکہ یہ مکتوبات ہی ہیں جو کسی بھی ادیب کے داخل تک رسائی کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے جو کہ دوسروں کے ساتھ رابطہ رکھے بغیر اس دنیا میں تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔اس کو لازم دوسروں کے ساتھ رابطے میں رہنا پڑتا ہے۔کبھی روبرو رابطہ ہوتا ہے تو کبھی تحریری صورت میں، تحریری صورت ہی وہ صورت ہے جس کو مکتوب نگاری کا نام دیا جاتا ہے۔بعض ناقدین تو مکتوب نگاری کو آدھی ملاقات کا درجہ بھی دیتے ہیں۔وہ شخص جو ہم سے دور ہو لیکن ہم اپنے جذبات کو اس تک پہنچانا چاہتے ہوں تو اسی صورت میں ہم قلم وکاغذ کا سہارا لیتے ہوئے اپنے جذبات کو سپرد صفحہ قرطاس کرتے ہیں۔یہ عمل مکتوب نگاری کہلاتا ہے۔اس میں زیادہ تر تین لوگ شامل ہوتے ہیں۔خط لکھنے والا، جس کو خط لکھا جائے اور وہ جو اس خط کو لے کر جائے۔لہٰذا اس عمل کو تن تنہا انجام نہیں دیا جا سکتا۔

مکتوب نگاری کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے گفتگو کو محفوظ کیا جا سکتا ہے اور بعد میں سند کے طور پر بھی پیش کی جا سکتی ہے۔یہ ایک بہت وسیع عمل ہے جس کی ضرورت ہر دور میں عام وخاص کو رہی ہے۔مکتوب نگاری ایک عام انسان سے لے کر کھیتوں میں کام کرتے انسان سے انبیا تک کی ضرورت رہی ہے۔انبیا کرام نے اللہ کا پیغام لوگوں

تک پہنچانے کے لیے مکتوب نویسی کا سہارا لیا۔ حضرت سلیمانؑ اور حضرت محمدؐ کے مکتوبات اس بات کے گواہ ہیں۔ یہاں ایک اہم نکتے کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ خط جتنا عام ہے اتنا خاص بھی۔ ہر خط زندہ وجاوید نہیں رہ سکتا۔ وہی خط زندہ رہتے ہیں جن کے لکھنے والوں کو خط لکھنے کا ہنر آتا ہے جو اپنے لکھنے والوں کی سیرت کے عکاس ہوں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے وہی مکتوبات تاریخ کا حصہ بنتے ہیں جو کہ کاغذ کے ٹکڑوں پر نہیں بلکہ دل کے ٹکڑوں پر لکھے جائیں۔

مکتوبات نویسی کی ایک خامی یہ ہے کہ اس میں جذبات کی عکاسی ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جس طرح دوران گفتگو انسان مختلف حرکات وسکنات کا سہارا لیتا ہے مکتوب نویسی میں یہ ممکن نہیں۔ اس سے قطع نظر کہ مکتوبات ادب کا شعبہ ہیں کہ نہیں لیکن اگر مکتوب نویسی کے دوران ایک مخصوص ماحول، مزاج اور خاص لکھنے والا ہاتھ میسر آجائے تو یہ ادب کی حدوں کو چھوتے ہوئے ادب کی صنف بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے لیے مکتوب نگار کا خون جگر چاہیے ہوتا ہے جو کہ قدرت کی طرف سے ایک خاص عطا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا انداز اپنانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ مکتوب نگاری کے لیے کچھ اصول وضوابط مقرر کیے گئے جن کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ سب سے پہلے مکتوب ایسا ہو کہ جس مقصد کے لیے لکھا جائے اس کو حاصل کر لے۔ دوسرے قاری کی دلچسپی کا سامان موجود ہو اس میں۔ مکتوبات میں لازم ذاتی اور نجی پہلو شامل ہوں۔ واقعات میں ترتیب ہو ربط ایک لازمی عنصر ہے۔ جس کا خیال رکھا جانا ضروری ہے۔ بے ربط مکتوبات دلچسپی ختم کر دیتے ہیں۔ مکتوبات کو بہت طویل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ طوالت اس کی خامی بن سکتی ہے۔

مکتوب لکھنے والے کی ذات کا عکاس ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو یہ عکاسی ہر حال میں کرنی چاہیے۔ وہی مکتوبات کامیاب ہوتے ہیں جو کہ اپنے لکھنے والے کی شخصیت کے نہاں گوشوں کو متعارف کرواتے ہیں۔ وہی مکتوب کامیاب ہوں گے جن کے اندر پڑھنے والوں کے لیے اپیل ہو گی۔ مکتوبات کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ رسمی بھی ہو سکتے ہیں اور شخصی بھی۔ مکتوب نویسی کی تاریخ کا اگر کھوج لگایا جائے تو یہ ایک مشکل امر ہو گا لیکن ایک اندازے کے مطابق

دنیا کی تاریخ کا قدیم ترین خط وہ ہے جو کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس کے نام لکھا تھا اور اس خط کا واضح ذکر قرآن مجید میں بھی ملتا ہے۔

ایک تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ مکتوب نگاری قدیم روم سے شروع ہوئی لیکن وہاں بلاغت کے اصولوں کا مکمل خیال رکھا جاتا تھا اور ان سے روگردانی ایک بہت بڑا گناہ تھی۔ یونان میں مکتوب نگاری کو پذیرائی نہیں مل سکی کیونکہ یہاں لوگوں میں روابط مفقود تھے۔اپنے علاقے کے لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے یونانیوں کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ قدیم مصر میں تین ہزار سال قبل بھی مکتوب نگاری کی روایت ملتی ہے۔لاطینی میں مکتوب نگاری کے ضمن میں ہیورس کا نام قابل ذکر ہے۔انگلستان کی سرزمین میں یہ روایت پندرھویں صدی میں ملتی ہے۔لیکن اس میں صرف وعظ سنائے جاتے تھے جو کہ حضرت عزائیل کے صور سے کم نہیں ہوتے تھے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان مکاتیب میں ذاتی باتوں کے علاوہ سب کچھ موجود ہوتا تھا۔

انگلستان میں جیمسر ہاول کا نام اس سلسلے کا اہم ترین نام ہے اور اس کے بعد جان ہیرنگ کا نام قابل ذکر ہے۔اٹھارہویں صدی میں دو نام قابل ذکر ہیں ان میں ایک شاعری کی دنیا سے گہرے اور دوسرا ایک خاتون ہیر ارٹلے مانٹیگ ہے جس کے زیادہ تر مکتوبات اس کی بیٹی کے نام ہیں۔رومانوی دور میں چارلیس لیمپ اور کیٹس کے نام قابل ذکر ہیں۔عرب کی سرزمین میں مکتوب نگاری بہت قدیم فن کے طور پر جانی جاتی ہے۔ سرزمین ہندوستان پر فارسی کا غلبہ صدیوں تک رائج رہا۔یہ ہی وجہ ہے کہ مکتوب نگاری بھی شروع میں فارسی کے زیر اثر رہی۔لیکن مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ہی فارسی زبان کی تنزلی اور اردو زبان کا عروج شروع ہو گیا تھا۔ اردو مکتوب نگاری کے ارتقا میں ایک اہم نام مرزا قتیل ہے ان کا مجموعہ ''معدن الفوائد'' ہے۔اس میں اردو کے پانچ مکتوبات ملتے ہیں۔ان کے بعد غلام غوث بے خبر کا نام سامنے آتا ہے۔ان کے مکاتیب کا مجموعہ ''انشائیئے بے خبر'' ہے۔اس میں تیس مکاتیب ملتے ہیں۔رجب علی بیگ سرور کے مکتوبات اس دور کی تہذیب کے عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ لکھنوی تہذیب کے نمائندے بھی ہیں۔ان کے مجموعے کا نام انشائے سرور ہے۔ان کی اہم خوبی یہ ہے کہ لفظ کی تازہ شکل استعمال کرتے تھے۔یہ ہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ان کی زبان زندہ زبان ہے۔

نواب واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے مکتوبات بھی اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔اگر اردو مکتوب نویسی کے زمانہ عروج کی بات کی جائے تو یہ بلاشبہ مرزا غالب کا دور ہی ہے۔غالب کے مکتوبات میں جدت پائی جاتی ہے۔مرزا غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ ان کی زندگی میں ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا جو کہ عود ہندی تھا۔اس کے علاوہ اردوئے معلی، مکاتیب غالب اور نادر خطوط غالب بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

مکتوب نگاری کا دوسرا دور سرسید اور ان کے رفقا کا ہے۔سرسید کے مکتوبات میں تکلف اور تصنع نام کو نہیں ملتی۔سرسید کے خطوط مکمل طور پر ملکی مفاد کے پیش نظر لکھے گئے۔سرسید کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔سرسید کے ساتھی مولانا الطاف حسین حالی بھی سرسید کے مشن کے حامی تھے۔ان کے مکتوبات میں جدید القاب وآداب پائے جاتے ہیں۔یہ مکتوبات مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا مرثیہ معلوم ہوتے ہیں۔مہدی علی خان اور وقار الملک بھی سرسید کی فوج کے ہی سپاہی تھے۔ان کے مکاتیب کی حیثیت دستاویزی ہے۔شبلی نعمانی سرسید کے باغ کا ایک مہکتا ہوا پھول تھا، جس کی زبان انتہائی خوبصورت تھی۔شبلی محض مقصدی ادب کے قائل نہیں بلکہ مقصد میں حسن کے خواہاں دکھائی دیتے ہیں۔

شعرا میں سے اکبر الہ آبادی کا ذکر بھی مکتوب نگاروں کی صف میں بھی ہوتا ہے۔اکبر کے مکتوبات جدیدیت کی مخالفت کرتے ہیں اور مذہب کے حامی ہیں۔

علامہ اقبال کے مکتوبات تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ان کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے مکتوبات ان کی شاعری کی مانند فکر اور فلسفے سے بھرپور ہیں۔یہاں ایک ایسا شخص سامنے آتا ہے جو کہ شاعر ہی نہیں بلکہ قومی رہنما، دین کا عالم اور فلاسفر بھی ہے۔

نیاز فتح پوری کے مکاتیب رومانویت کے زیر اثر ہیں۔ان میں ان کی شخصیت کے نہاں گوشوں تک رسائی ملتی ہے۔مولانا محمد علی جوہر کے مکاتیب ایک سیاسی رہنما کے مکاتیب ہیں جو کہ قوم کا خیر خواہ ہے۔عبدالماجد دریا آبادی کے مکتوبات میں ہم کلامی ملتی ہے۔خواجہ حسن نظامی اور مولانا مودودی کے مکاتیب میں مذہب کی جھلک زیادہ ملتی ہے کیونکہ یہ تبلیغی نکتہ نظر سے لکھے گئے۔

یاس یگانہ چنگیزی اور شاد عارفی کے ہاں انا اپنے عروج پر ملتی ہے۔ محمد علی ردولوی مٹتی ہوئی تہذیب کے آخری شاہد ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بحیثیت مکتوب نگار کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ غبار خاطر ان کے مکتوبات کا اہم ترین مجموعہ ہے۔اس کے علاوہ کاروان خیال اور نقش آزاد بھی شامل ہیں۔

ناقدین میرا جی کو نفسیاتی ادیب گردانتے ہیں۔ لیکن شاعری کے برعکس اپنے مکتوبات میں ان کی شخصیت کا بہت سے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔لاپرواہ نظر آنے والا میرا جی معمولی باتوں کے لیے پریشان نظر آتا ہے۔ میرا جی کے مکاتیب نئی تحریریں اور نقوش میں اشاعت کے ذریعے منظر عام پر آئے ہیں۔ میرا جی کی شاعری اور مکاتیب میں ملنے والا تضاد ابن انشاء کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔جوگی اور بنجارہ ایک دنیادار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کے مکاتیب میں دو انتہاؤں کا سفر ملتا ہے۔ کبھی انسان کو وحشی اور درندہ تسلیم کرتے ہیں تو کبھی اسی انسان کو فرشتے کے روپ میں دکھاتے ہیں۔ خلیل الرحمن اعظمی کے مکاتیب ان کے باطن تک رسائی کا اہم ذریعہ ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے مکتوبات ایک ایسے شخص سے ہمارا تعارف کرواتے ہیں جو کہ زندگی کے مصائب وآلام سے پریشان ہیں اور جوانی کے دنوں کو یاد کر کے زندگی گزار رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے روح رواں سید سجاد ظہیر کے مکاتیب کا مجموعہ نقوش زندان ہے۔ان کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ایک شوہر کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ زندگی کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں اور اچھے دنوں کو یاد کرتے ہیں۔ فیض احمد فیض کے مکاتیب میں بھی شوہر اور باپ کا روپ ملتا ہے۔ فیض کے مکاتیب کا مجموعہ صلیبیں میرے دریچے میں پہلے انگریزی اور بعد میں اردو میں شائع ہوا۔

صفیہ اختر کے مکاتیب کا مجموعہ زیر لب جب کہ حسن نثار کا آدھی ملاقات کے نام سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر انور سدید ادب کی دنیا کا ایک جگمگاتا ستارہ ہیں۔ان کا اصل نام محمد انور الدین تھا۔یہ ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان سری نگر سے ہجرت کر کے ضلع سرگودھا میں آ کے آباد ہوا۔انور سدید کی شادی ۹ مئی ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ان

کے چار بیٹے تھے۔ عملی زندگی کا آغاز محکمہ آب پاشی سے بطور سب انجینئر کے طور پر کیا۔ڈاکٹر انور سدید انتہائی محنتی اور ایمان دار آفیسر تھے۔اپنے عشق کی آبیاری کے لیے انجینئرنگ کے ساتھ ساتھ آپ نے اردو ادب کی تعلیم بھی حاصل کی۔۱۹۷۹ء میں اردو ادب کی تحریکیں لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس کتاب پر ان کو ہجرہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ابتداً ادب کا شوق ان کے اندر ان کے استاد مولوی پیر بخش اور ان کے بھائی معراج الدین نے اجاگر کیا۔لیکن اس چنگاری کو عشق کا رتبہ ڈاکٹر وزیر آغا کی صحبت نے عطا کیا۔ ادب میں ڈاکٹر انور سدید کی خدمات ہر شعبے میں ہیں۔یہ محقق، نقاد، مزاح نگار، کالم نگار، تبصرہ نگار، مترجم اور افسانہ نگار قابل قدر ہیں۔انھوں نے ۸۰ سے زائد علمی وادبی کتابیں لکھی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات کے صلے میں ان کو بہت سے اعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں رائٹر گلڈ ایوارڈ، نقوش ایوارڈ، تمغہ امتیاز صدر پاکستان ۲۰۰۸ء کا ایوارڈ شامل ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ نہ صرف خود لکھتے تھے بلکہ دوسروں کے اندر بھی تحریک پیدا کرتے تھے۔ان کی ذات سے ادب اور ادیب دونوں ہی فیض یاب ہوئے۔مرتے دم تک انھوں نے قلم کے ساتھ رشتہ باندھے رکھا۔مارچ ۲۰۱۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا تب بھی ان کی غزل الحمراء میں شائع ہوئی۔ حتی کہ ۲۰ مارچ (انور سدید کی وفات کا دن) کو بھی ان کا کالم نوائے وقت میں چھپا۔

ڈاکٹر انور سدید کے جہاں اور بہت سے حوالے ہیں ان کا ایک اور اہم حوالہ مکتوب نگاری بھی ہے۔انھوں نے تمام ادبی رسائل کے مکتوبات لکھے۔ان مکتوبات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر انور سدید ادب میں وہ نام ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ رسالہ جاتی مکاتیب لکھے۔ان کا نام لکھنے والوں کے لیے حوصلے کا استعارہ ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نہ صرف دوسروں کو لکھنے کی ترغیب دیتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کی بھی کوشش کرتے کہ لکھنے والا اپنے علم کو شائع کروائے تاکہ وہ دوسروں تک رسائی ممکن ہو سکے۔ ادب کی ترقی ڈاکٹر انور سدید اپنی ترقی گردانتے تھے اور اس بات کا اندازہ ان کے مکاتیب سے جابجا لگایا جا سکتا ہے۔جب بھی کوئی ادبی رسالہ ان کو ملتا اس پر وہ خوشی محسوس

کرتے۔ان کے مکتوبات میں زیادہ تر وہ مکتوبات شامل ہیں جو کہ انھوں نے رسائل کے نام لکھے۔ ان کی حیثیت تجزیاتی ہے۔یہ اپنے مکتوبات میں ادیبوں کو تنقید کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ان کو اچھا لکھنے پر شاباش دیتے اور غلطی پر ہمدردی کے ساتھ درستی کرواتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات مختلف رسائل میں شائع ہوئے جن میں تخلیق، نالہ دل، اسالیب، الحمرا اور بہت سے دیگر رسائل شامل ہیں۔ڈاکٹر انور سدید ان رسائل کو بہت اہمیت دیتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ رسائل لکھنے والوں کے لیے پلیٹ فارم کی حیثیت رکھتے ہیں۔اگر یہ رسائل نہ ہوتے تو ادب یقینا بہت سے ادیبوں سے محروم رہ جاتا۔ ڈاکٹر انور سدید یہ خیال کرتے تھے کہ اگر یہ رسائل نہ ہوں تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کی بیٹی گھر بیٹھی بوڑھی ہو جائے اور اس کو تحسین کرنے والا شوہر نصیب نہ ہو۔ادبی پرچے کو وہ صدقہ جاریہ خیال کرتے تھے۔ادبی رسائل میں مکتوبات کے حصے کو بھی یہ بہت اہمیت دیتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں کوئی بھی ادیب اپنی تحریر میں نکھار۔ان مکتوبات کو پڑھ کر پیدا کر سکتا ہے۔ ان کے مکتوبات سے ایک نکتہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ کسی کی تحریر پر رائے زبانی نہیں بلکہ لکھ کر دینی چاہیے تاکہ وہ سند کے طور پر محفوظ کی جا سکی۔

اچھی کتاب سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔اس کا اندازہ ان کے مکتوبات سے ہوتا ہے جس میں اپنے دوستوں سے کتابیں مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کے علاوہ تعلیمی اداروں میں موجود کتب خانوں کی اہمیت کو بھی جابجا اجاگر کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی گہرے رنج کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں اساتذہ کرام اپنے پیشے کے ساتھ مخلص نہیں رہے۔ان کا مقصد علم کی فراہمی نہیں بلکہ پیسے کا حصول ہے۔مفاد پرستی عام ہو چکی ہے۔

ادب اور ادیب کے تعلق پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ ادیب کی ذات کو ادب سے جدا کرنا ناممکن ہے۔اس لیے کسی بھی ادیب کے نفسیاتی اور سماجی حالات سے ادب کا متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ادیبوں کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے اور حکومت سے بارہا یہ مطالبہ کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں کہ حکومت کو ادیبوں کی سرپرستی کرنی چاہیے۔کسی بھی ادیب کی بیماری یا موت ان کو پریشان کر دیتی تھی۔ وہ ادیبوں کو اخلاقی

اعتبار سے بھی مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ان کے خیال میں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو بجائے اس پر پردہ ڈالنے کے اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر انور سدید حکومتوں کے اس رویے سے نالاں تھے کیونکہ ان کے خیال میں حکومتیں ادیبوں کی سرپرستی نہیں کرتیں سوائے چند لوگوں کے۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں جابجا ترقی پسند تحریک کا بھی ذکر ملتا ہے۔جس میں ترقی پسند تحریک اور اس سے تعلق رکھنے والے لوگ سامنے آتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب میں پروپیگنڈے کے خلاف تھے۔وہ ادب میں کتھارس کو ضروری خیال کرتے تھے۔وہ ترقی پسند کے اس گروہ کے خلاف تھے جن کے قول وفعل میں تضاد پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں ادب اور سیاست کا رخ بھی سامنے آتا ہے۔ان کے خیال میں ادیب چونکہ اس معاشرے کا فرد ہے لہٰذا وہ سیاسی صورت حال سے بھی متاثر ہوتا ہے۔وہ اپنے مکتوبات میں بہت سی جگہوں میں مارشل لا کے دور میں ہونے والی ادبی تبدیلیوں کو موضوع بناتے ہیں۔ان کے خیال میں اس کے اثرات ادب میں بہت دور رس تھے جو کہ وقت گزرنے کے بعد بھی ملتے رہے۔اس کے علاوہ ادیبوں کے منافقانہ رویے کو بھی زیر بحث لاتے ہیں کہ ادیب کس طرح اپنی ضرورتوں کے غلام ہیں۔وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے مفادات کے حصول کے لیے اپنی وفاداریاں حکومتوں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک پرامن شخص تھے اور جنگ وجدل کے مکمل خلاف تھے۔بھارت میں ایٹمی دھماکے ہوئے تو اس پر انھوں نے انتہائی پریشانی کا اظہار کیا کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح دونوں ممالک میں جنگ کا خدشہ ہو گا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ بجائے پیسہ جنگی ہتھیاروں پر خرچ کرنے کے دونوں ممالک کو اپنے غریب عوام کی فلاح وبہبود کے لیے خرچ کرنا چاہیے۔ ان کے خیال میں حکمرانوں کو ایماندار ہونا چاہیے اور اس ملک کے وسیع تر مفاد میں کام کرنا چاہیے لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ حالات اس کے برعکس ہیں۔ ہمارے حکمران مفاد پرست اور بداعمال ہیں۔

ان کے مکتوبات میں ملکی مسائل کا بھی جابجا تبصرہ ملتا ہے۔ جن میں بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ شامل ہے۔علم کی اہمیت کی بات کرتے ہیں لیکن ان کے خیال میں سائنسی تعلیم کے ساتھ ساتھ فکر وفلسفے کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے۔ان کے مکتوبات میں لسانیات کا علم بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد پر بھی ان کا نظریہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

ادب میں نقاد کی اہمیت کے بارے میں بھی بات کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ادبی اداروں کا کردار بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ان کے خیال میں کسی کتاب کی کامیابی میں نقاد بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ادب کی تمام اصناف میں ڈاکٹر انور سدید نے قلم فرسائی کی یہ ہی وجہ ہے کہ ان کے مکتوبات میں تمام ادبی اصناف کا تفصیلی تذکرہ ملتا ہے۔جن میں انشائیہ، افسانہ، ڈرامہ، ناول، نظم، غزل وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں واقعاتی غلطیوں کی اصلاح بھی ملتی ہے۔جس سے ان کے علم کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ان کے مکتوبات میں ادب کا تذکرہ جابجا ملتا ہے۔تاہم کچھ مکتوبات ایسے بھی ہیں جو کہ ان کے داخل تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ کچھ مکتوبات میں اپنےگھروالوں کا ذکر بہت محبت کے ساتھ کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ بھائی معراج الدین کی موت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔اپنے ادبی کام کا تذکرہ کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید اس بات کے خلاف تھے کہ زندہ ادیبوں پر مقالے لکھے جائیں۔اس کے علاوہ ان کے مکتوبات میں ان پر ہونے والے جامعاتی تحقیقی کام کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ تحقیقی کام میں وہ سرقے کے مخالف تھے اور محققین کو محنت کا درس دیتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے مکتوبات میں اپنی بیماری کا ذکر بھی بہت دفعہ کرتے ہیں اور زندگی اور موت کے فلسفے کو بھی بہت خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ڈاکٹر انور سدید وزیر آغا کے بہت قریبی ساتھی تھے۔ادب میں دو گروپ تھے ایک احمد ندیم قاسمی کا حامی اور دوسرا ڈاکٹر وزیر آغا کا۔انور سدید کا تعلق وزیر آغا گروپ سے تھا۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات میں جابجا اس گروپنگ کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کا فنی جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مکتوب نگاری کی فنی نزاکتوں کو پیش نظر رکھا۔ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم تھا۔

انداز تحریر میں طنز کے ساتھ ساتھ ہلکا پھلکا مزاح کا انداز بھی ملتا ہے۔زبان کو بہت خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔

مکالمہ نگاری بھی ان کے مکتوبات میں بہت اہمیت کے حامل ہے۔ یوں خط لکھتے ہیں کہ گویا اگلا بندہ ان کے سامنے بیٹھا ان سے باتیں کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ متضاد الفاظ اور قافیے کا انداز بھی اپناتے ہیں۔ تجسس پیدا کرنے کے لیے سوالیہ طریقے کو بھی استعمال میں لاتے ہیں۔طنز ان کے مکتوبات کی ایک بہت بڑی خوبی ہے۔زبان پر گرفت کا اندازہ ان کے ہاں محاورات کے استعمال سے ہوتا ہے۔ جزئیات نگاری اور خود کلامی کی تکنیک بھی استعمال کرتے ہیں۔منظر نگاری میں انتہائی کمال رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ مگر یوں کہ ان کا استعمال ناگوار نہیں گزرتا۔ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات نگاری کے باب میں ایک جزو جو کہ نہایت اہمیت کے حامل ہے۔وہ ان کا مکتوب نگاری میں انداز غالب کی پیروی ہے۔

غالب، غالب ہے۔چاہے وہ نثر کی دنیا ہو یا نظم کا میدان ہر کسی نے غالب کے لب ولہجے میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ بہت سے شعرا کے ہاں غالب کا اسلوب نمایاں ہے اور اس کی زمین پر بہت سی غزلیں لکھی گئی ہیں جو کہ غالب کا رنگ وآہنگ لیے ہوئے ہیں۔ نظم کے ساتھ ساتھ نثر کے میدان میں بھی غالب کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور نثر میں مکتوب نگاری سب سے زیادہ اہم ہے اور ان کی مدد سے ہی غالب کو اصل رنگ میں دیکھتے ہیں۔اس کے حالات وواقعات اسے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔زبان کو جس خوبصورتی کے ساتھ غالب نے برتا ہے کوئی اور یہ نہ کر سکا۔ نظم کی طرح بہت سے لوگوں نے اندازِ غالب کی نثر میں بھی پیروی کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔لیکن کسی کو اس میں مکمل کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔

غالب کے مکتوبات میں جو بات قاری کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا نرالا اور اچھوتا انداز ہے جو کبھی مکالماتی ہے تو کبھی استفہامی۔اسی اسلوب کو بہت سے لکھنے والوں نے نقل کیااور ان میں ایک نام ڈاکٹر انوار سدید کا بھی ہے۔ غالب کے نئے خطوط کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید نے ۱۵ مکتوب ماہنامہ تخلیق کے مدیر اظہر جاوید اور عذرا اصغر کے نام تحریر کیے۔اس میں غالب کے اسلوب اور زبان کو اپنانے اور نبھانے کی مکمل کوشش کی گئی۔ سب سے پہلے

القاب وآداب کے ضمن میں غالب اور انور سدید کے مکتوبات کا جائزہ لیا گیا تو اس میں بہت حد تک ڈاکٹر انور سدید نے غالب کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی۔القاب وآداب میں اسی ہی بے تکلفی کو روا رکھا گیا جو کہ غالب کا خاصا تھا۔ غالب، ہر گو پال تفتہ کو کاشانہ دل کے ماہ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو دوسری طرف ڈاکٹر انور سدید اسی پیروی میں اظہر جاوید کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔کاشانہ دل کے ماہ دو ہفتہ میرزا اظہر جاوید۔ اس کے علاوہ غالب کے ہاں برخوردار، میری جان، بھائی وغیرہ کا صیغہ بار بار ملتا ہے۔تو ڈاکٹر انور سدید بھی انہی لفظوں کو جابجا کام میں لاتے دکھائی دیتے ہیں۔ غالب بغیر تمہیدی کلمات کے اپنے خط کا آغاز اکثر کرتے تھے۔غالب کی تقلید کرتے ہوئے ہمارے دور کے غالب انور سدید نے اسی انداز کو جابجا برتا ہے۔ ظرافت اور مزاح غالب کا خاصا ہے۔غالب کے مکتوبات میں ظرافت کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا انور سدید بھی اس عنصر کے استعمال سے شگفتگی پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے مکتوبات میں بے ساختہ سنجیدگی کی جگہ شوخ مسکراہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ڈاکٹر انور سدید جب شگفتہ پیرائے میں بات کرتے ہیں تو غالب خودبخود ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ شعر وشاعری کا استعمال غالب کے مکتوبات کا خاصا ہے۔بہت سی جگہوں پر اپنی بات کی وضاحت کے لیے شعر کا سہارا لیتے ہیں۔غالب کی پیروی میں یہ ہی انداز ڈاکٹر انور سدید کے ہاں بھی ملتا ہے۔ طنزیہ لہجہ غالب کے مکتوبات میں بہت زیادہ ہے۔غالب اس سے جابجا کام لیتے ہیں اور طنز کی یہ کاٹ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔طنز کی یہ ہی کاٹ غالب کے رنگ میں ڈاکٹر انور سدید کے ہاں بھی ملتی ہے جس سے وہ اپنی بات کو کاری کرتے ہیں۔ وہی مکتوبات کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے لکھنے والے کی ذاتی حالات وواقعات سے واقفیت کا ذریعہ بنتےہیں۔یہ وجہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید بھی اندازِ غالب میں جب لکھتے ہیں تو ذاتی حالات وواقعات سے آگاہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ذاتی حالات کے علاوہ معاشرتی حالات کا بھی بہت خوبصورت بیان ملتا ہے۔سوالیہ انداز غالب کا خاصا ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے بھی اس انداز سے مکمل طور پر انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ مکالمہ نگاری، منظر نگاری اور قافیہ بندی کو بھی رنگ غالب میں اپنانے کی پوری کوشش ملتی ہے۔

اختتامیہ خط کا آخری حصہ ہوتا ہے۔انور سدید نے اس حصے میں بھی غالب کے انداز کو برقرار رکھا ہے۔ڈاکٹر انور سدید کے ان تمام مکتوبات کا جب جائزہ لیا جائے تو میری ناقص رائے

میں ڈاکٹر انور سدید نے رنگ غالب کو اپنانے میں بہت حد تک کامیاب ٹھہرے۔ڈاکٹر انور سدید نے اس کے لیے صحیح معنوں میں غالب سے واقفیت پیدا کی۔ان کی شاگردی اختیار کی۔وہ تمام اسلوب جو غالب کا ہے اس کو سمجھا، سیکھا اور پھر قلم اٹھایا۔ان تمام مکتوبات نے دنیائے ادب میں تہلکہ مچا دیا جس نے بھی ان کو پڑھا وہ ان کی سحر انگیزی میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔قریباً ہر کسی نے اعتراف کیا کہ ڈاکٹر انور سدید نے رنگ غالب کو اپنانے کی جو سعی کی وہ اس میں کامیاب ٹھہرے۔

ڈاکٹر انور سدید کی اس کاوش کو بہت بڑے نقادوں نے پسند کیاان کی کی حوصلہ افزائی کی۔ اس مقالے کے آخر میں ڈاکٹر انور سدید کے غیر مطبوعہ مکتوبات کا عکس لگایا گیاہے۔ان میں سے ایک مکتوب جناب خالد اقبال یاسر کے اور دو ایڈیٹر اسالیب ذوالفقار احسن کے نام ہیں۔

نتائج:

اردو ادب میں مکاتیب کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے ان کی تاریخی اور ادبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ مکاتیب ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے ہم اپنے مشاہیر کی حالاتِ زندگی سے واقفیت حاصل کر کے ان کی سوانح عمری لکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جو لکھنے والوں کے داخل تک رسائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی جہاں دیگر ادبی تخلیقات قابل ستائش ہیں وہاں ان کے ساتھ ساتھ مکاتیب بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں ان مکاتیب پر تحقیقی کام کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ڈاکٹر انور سدید کے مکاتیب نہ صرف خود ان کی اپنی زندگی سے واقفیت کا ذریعہ ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کے عہد سے بھی آگاہ کرتے ہیں ان کی مدد سے دیگر ادبا کے حالاتِ زندگی ہمارے سامنے آتے ہیں لہذا یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ یہ مکاتیب اس دور کی ادبی تاریخ مرتب کرنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فنی حوالے سے یہ مکاتیب مکتوب نگاری کی فنی نزاکتوں پر پورا اترتے ہیں اسلوب سادہ اور عام فہم ہے جو کہ قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے ڈاکٹر انور سدید کے مکاتیب کے موضوعات بے حد متنوع ہیں سب سے بڑا موضوع علم و ادب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ فکر و فلسفہ، مذہب، درسگاہوں کی تعلیمی حالت، معاشرتی حالات، اقتصادی اور سیاسی صورتحال بھی سامنے آتی ہے۔

اردو ادب میں یہ مکاتیب ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتے ہیں یہ ایک ایسا ادبی ورثہ ہے جو کہ اس دور کے لکھنے والوں کو زندہ رکھے گا اور آنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو گا۔

سفارشات:

مکاتیب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر درج ذیل پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ ڈاکٹر انور سدید کے تمام مکتوبات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا جائے۔

۲۔ ان مکتوبات کو موضوعاتی اعتبار سے الگ درجہ بندی کر کے مرتب کیا جائے۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید کے نام لکھے گئے مکتوبات پر بھی تحقیقی کام کروایا جائے۔

۴۔ ڈاکٹر انور سدید کے مکتوبات کو شاملِ نصاب کیا جائے۔

۵۔ مختلف تعلیمی اداروں میں مکتوب نویسی کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے سیمینار منعقد کروائے جائیں تاکہ اس اہم ادبی ورثے کو محفوظ کیا جا سکے۔

۶۔ جدید زمانے میں سائنسی ترقی کے باعث موبائل فون، ای میل اور ایس ایم ایس کی وجہ سے مکتوب نگاری کی صنف پر بہت برے اثرات پڑے ہیں بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ یہ صنف ناپید ہوتی جا رہی ہے۔اس لیے اس کو محفوظ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

۷۔ ڈاکٹر انور سدید کے مکاتیب مرتب کرنے سے نہ صرف یہ مکاتیب محفوظ ہو جائیں گے بلکہ اس سے اردو ادب کے دامن کو بھی وسعت ملے گی کیونکہ ان کی مدد سے ادبی تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

تخلیق، ماہنامہ، لاہور، شمارہ ۷۔۸۔۱۱۔۱۲، ۱۹۷۶ء، شمارہ ۳، ۴، ۱۱، ۱۹۸۰ء، شمارہ ۱۹۸۱، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ء، شمارہ ۳، ۴، ۱۲، ۱۹۸۹ء شمارہ ۸، ۱۹۹۲ء، شمارہ ۱۹۹۵، ۲، ۴، ۶، ۱۰، ۱۲ء، شمارہ ۸، ۱۹۹۸ء، شمارہ ۸، ۲۰۰۰ء، شمارہ ۱، ۲۰۰۱، ۶، ۱۰ء، شمارہ ۶، ۲۰۰۵ء

انگارے، ماہنامہ، ملتان، شمارہ ۱۲، ۲۰۰۳، شمارہ ۱۲، ۲۰۰۳ء، شمارہ ۲، ۱۱، ۲۰۰۵ء

الحمرا، ماہنامہ، لاہور، شمارہ ۲، ۱۰، ۲۰۱۰ء، شمارہ ۴، ۶، ۷، ۲۰۱۲ء، شمارہ ۲، ۴، ۷، ۲۰۱۳ء

نالہ دل، سہ ماہی، بھیرہ، شمارہ ۱۲، ۱۳، ۲۰۱۲ء، شمارہ ۱۴، ۱۵، ۲۰۱۳ء، شمارہ ۱۰، ۲۰۱۴ء

انور سدید، ڈاکٹر، غالب کے نئے خطوط، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۸۲ء

نردبان، ماہنامہ سرگودھا، شمارہ ۳۔۴، ۱۹۹۲ء

ثانوی ماخذ:

احمد علی مرزا، انشائیے، سرور، مطبع نول کشور، لکھنو، س ن

انوار احمد، ڈاکٹر، مرتب، غالب کے بہتر خطوط، قومی مقتدرہ، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

انور سدید، ڈاکٹر، خطوط کے آئینے میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، اگست ۲۰۰۷ء

خلیق انجم، مرتب، غالب کے خطوط، جلد اول، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۹ء

خلیق انجم، مرتب، غالب کے خطوط، جلد دوم غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

خلیق انجم، مرتب، غالب کے خطوط، جلد سوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۰ء

سید اشفاق حسین بخاری، ڈاکٹر، اردو مکتوب نگاری، شاخ زریں اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

سید جاوید اقبال، خط نگاری، قصر الادب، حیدرآباد، دسمبر ۲۰۱۵ء

سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء

سید عبداللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

شاداب تبسم، ڈاکٹر، اردو مکتوب نگاری، مکتبہ جامع، نئی دہلی، دسمبر ۲۰۱۲ء

غلام رسول مہر، ذکر غالب، ترقی اردو بیورہ، نئی دہلی، ۱۹۲۴ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

کوکب قدر سجاد علی، واجد علی شاہ کی علمی و ادبی خدمات، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

محمد اسماعیل پانی پتی، مکاتیب حالی، لاہور، ۱۹۵۰ء

مرتضی حسین فاصل، سید، مرتب، اردوئے معلی، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۲۹ء

مرتضی حسین فاصل، سید، مرتب، اردوئے معلی، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء

مرزا ادیب، مرتب، تنقیدی مقالات: حصہ نثر، لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۴۵ء

مشتاق حسین، مکاتیب سر سید احمد خان، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، انار ادب بیاد ڈاکٹر انور سدید، مقبول اکیڈمی، لاہور، جون ۲۰۱۶ء

رسائل و جرائد

اسالیب، سہ ماہی، سرگودھا، شمارہ ۲۳، ۲۰۱۶ء

نقوش، ماہنامہ، لاہور، مکاتیب نمبر، ۱۹۵۷ء

نگار، ماہنامہ، لکھنو، شمارہ ۷، ۱۹۴۰ء

لغات:

فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، انجمن بک ڈپو، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء

ضمیمہ جات

Dr. Anwar Sadid
172-Sutlej Block, Allama Iqbal Town
Lahore Ph:~~042-7820441~~ 0334/9719278
Daily "NAWA-E-WAQAT"
Fatima Jinnah Road
Lahore Ph:042-6307978

ڈاکٹر انور سدید
172- ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون: 042-7820441
روزنامہ "نوائے وقت" فاطمہ جناح روڈ لاہور
فون: 042-6307978

۲۱ اکتوبر ۲۰۰۶

برادرم خالد اقبال یاسر صاحب

سلام مسنون:

اگلے روز "شب خوں" کا آخری ضخیم شمارہ دیکھا تو اس میں آپ کی طویل نظم "رفعتی" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نظم کی دو باتوں نے بہت متاثر کیا:

اوّل۔ یہ موضوعی نظم متنوع انداز میں تخلیق ہوئی ہے۔

دوم۔ متن کی جذباتی رسم کو شاعر نے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور اظہار کی پوری داخلی قوت کے ساتھ اسے طویل نظم کی صورت دی۔ اسے اردو کی منفرد کاوش قرار دینا [illegible] معلوم ہوتا ہے۔

میرے خیال میں "شب خوں" میں اس کی اشاعت پر یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ اس کی فنی عظمت کا اعتراف فاروقی صاحب نے اور اس کا [illegible] نے کر لیا ہے۔ [illegible] "شب خوں" [illegible] نظم چھپی ہے؟ — ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے بتایا کہ یہ نظم کتابی صورت میں بھی چھپ چکی ہے۔ "شب خوں" میں آپ کی "گردش" کا ذکر تو کیا ہے لیکن "رفعتی" کی کتابی اشاعت کا ذکر نہیں کیا۔ یہ حرف تلبیہ کے طور پر چند سطور لکھ رہا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی یہ کتاب بھی عنایت کیجیے جو ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ نے تالیف کی ہے اور آپ کے ادارے سے "وفیات ناموران پاکستان" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ سرگودھا سے ذوالفقار احسن کا پرچہ "اسالیب" ملا تو اس میں [illegible] پر تبصرہ دیکھا۔ جس میں آپ کی اس اشاعتی خدمت کو بہت سراہا گیا ہے۔ ماشاء اللہ!

اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کی کتب شاید "نوائے وقت" کے دفتر میں بھیج دی جاتی رہی ہیں۔ اب [illegible] اس لیے دفتر کے ساتھ رابطہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ گھر پر [illegible] کتب ہی بھجوائیں۔ آپ کے ادارے کی کوئی کتاب عرصے سے نہیں ملی —

اس خط کو عید مبارک کے طور پر قبول فرمائیے۔

امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔

مخلص
[signature]
۲۱ اکتوبر ۲۰۰۶

جناب خالد اقبال یاسر
ڈائریکٹر اردو سائنس بورڈ
لاہور

Anwar Sadid
172-Sutlej Block
Allama Iqbal Town, Lahore
Ph.042-7820441
Cell: 0334-9719278
Daily "NAWA-E-WAQAT"
Lahore

انور سدید
172- ستلج بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
Ph.042-7820441
روزنامہ "نوائے وقت" لاہور

مکرمی ذوالفقار احسن صاحب!

سلام مسنون۔ "اسالیب" کا پندرہواں شمارہ جو نومبر ۲۰۱۲ تا فروری ۲۰۱۳ تک کے تین ماہ پر مشتمل ہے مل گیا ہے۔ اس کرم کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ خوشی ہوئی ہے کہ "اوراق"، "اردو زبان" اور "نردبان" کے بند ہو جانے کے بعد سرگودھا کے ادبی ماحول میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا۔ "اسالیب" نے اسے پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ویسے تو ادبی لحاظ سے سرگودھا اب بھی سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ اور اس کی سابقہ شادابی اگر ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر خورشید رضوی، پرنسپل غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی، ڈاکٹر سہیل بخاری، پرویز بزمی اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے موسوم ہوتی تھی تو اب اسے سلیم آغا قزلباش، عابد خورشید، خالد اقبال، اخلاق عاطف، محمود اسیر، ذوالفقار احسن، شاکر کنڈان، ڈاکٹر عابد سیال اور متعدد دیگر احباب کی ادبی کاوشوں سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ ان سب کی تخلیقی روشنی کی کرنیں "اسالیب" سے ابھرتی ہیں تو اردو ادب کے پورے آفاق کو روشن کر دیتی ہیں۔ اہم بات یہ کہ "اسالیب" کو آپ نے "عالمی اردو ادب کا پاسبان" قرار دے رکھا ہے اور اس کے صفحات پر دنیا کے لکھنے والوں کے مضامین شائع کیے جاتے ہیں اور بیرونی دنیا کے ادیبوں کی تحریروں پر شائستہ انداز میں نقد و احتساب بھی اٹھایا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ "اسالیب" کی ادبی محفل بہت بارونق نظر آتی ہے۔ خدا کرے "اسالیب" باقاعدگی سے چھپتا رہے۔

زیرِ نظر شمارے کے اداریے میں آپ نے ادبی اختلاف کو سوچ کو جلا دینے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ اور اس تنقید کی مذمت کی ہے جس کے تحت "بزعم خود خلا" قسم کے ادبا جو بالعموم خود پرستی، انائے بے جا اور نرگسیت کا شکار ہوتے ہیں — دشنام پر اتر آتے ہیں۔ آپ نے کراچی کے رسالہ "ارتقا" کے ایک مضمون کی طرف واضح اشارہ کیا ہے جس میں لندن میں پناہ گزین غیر معروف پاکستانی ادیب نے امتزاجی تنقید کے موضوع پر ایک تحقیر آمیز جوابی مضمون لکھا ہے اور تہذیب کے دائرے سے باہر نکل گئے ہیں۔ "اسالیب" کے زیرِ نظر شمارے میں جناب عابد خورشید نے اس دشنامی مضمون پر ہی عالمانہ بحث کی ہے جس کا عنوان ہے — "وزیر آغا اور امتزاجی تنقید: فکری مغالطے اور سرقے" — اس مضمون کے سرسری مطالعے سے ہی قاری اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے جس پر عابد خورشید اپنے مقالے کے پہلے پیراگراف میں پہنچ گئے ہیں۔ یعنی:

"عمران شاہد بھنڈر کے دل و دماغ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف شدید نفرت، کدورت، حسد، تعصب اور عناد کا لاوا جانے کب سے کھول رہا ہے — یہ لاوا ان کے مذکورہ مضمون کے ہر دوسرے تیسرے جملے پر کوبرے کی طرح پھنکارتا ہوا صاف نظر آتا ہے۔"

عابد خورشید مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بھنڈر صاحب کی غلط بیانیوں کا جواب لکھتے ہوئے جذباتیت کا اظہار نہیں کیا، غصے سے مغلوب نہیں ہوئے اور لایعنی اعتراضات کو دلیل کی روشنی سے مسترد کر دیا۔ انہوں نے بھنڈر صاحب کے مضمون کو بجا طور پر تیرہ دانش اور

(دوسری طرف)

بدتہذیبی کی ایک مثال قرار دیا ہے۔ جناب خورشید صاحب کا پورا مضمون پڑھنے کے بعد یہ عنوان درست نظر آتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ملبندار صاحب کے مضمون کو اردو دنیا کے کسی حلقے سے "تائید" نہیں ملی۔ وجہ یہ کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنی زندگی کے قریباً ستّر برس اردو ادب کی خدمت میں صرف کیے، متعدد موضوعات کو آغاز کی توانائی اور نئی روشنی دی۔ ان کے تصوراتِ ادب سے اختلاف بھی کیا گیا اور اثبات میں جو مضامین بلکہ کتابیں سامنے آئیں۔ ان ادبا میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شمس الرحمان فاروقی، فضیل جعفری، وارث علوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، عمیق حنفی اور ڈاکٹر ارمان نجمی کے علاوہ ادبا شامل ہیں۔ ان سب کے مقابلے میں عمران شاہ ملبندار محض طفلِ مکتب ہیں (ان کی ذاتی زندگی کے کچھ کوائف جناب صبا قریشی نے جرمنی سے شائع ہونے والے رسالہ "ادبِ جدید" میں پیش کر دیے ہیں)۔ ملبندار صاحب کے مضمون کی پذیرائی رسالہ "ارتقاء" میں بھی نہیں ہوئی۔ جاوید اختر بھٹی نے ملبندار صاحب کے اس مضمون کو ان کے "علمی جرم" سے تعبیر کیا اور لکھا:

"اگر ان کا علم ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر وزیر آغا سے زیادہ ہے تو پھر اتنا غصّہ کیوں؟ شاید جوانی کے خمار نے انہیں پریشان کر دیا ہے۔" (ارتقاء ۵۳ - ص ۳۷۵)

جناب غالب عرفان نے بے لاگ انداز میں رائے دی:

"عمران شاہ ملبندار نے مرحوم ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریروں کی روشنی میں جس طرح ان کی شخصیت پر کیچڑ اچھالی ہے وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے مترادف ہے۔ ہمارے دین میں تو موت کے بعد اس کی برائی کرنا مردار کا گوشت کھانے کے برابر مانا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ (وزیر آغا) زندہ ہوتے تو ملبندار صاحب کی ایک ایک عبارت کا جواب دیتے۔ اب تو وہ تحریر "قبر سے مردے اکھیڑنے" کا نام کہلائے گی" (حوالہ ایضاً، ص ۳۷۴)

اب پروفیسر ناصر کمالی کا تبصرہ پڑھیے: ان کی نظر میں ملبندار صاحب کا وجود ہی مشکوک ہے۔

"میرا خیال ہے کہ کوئی بھی تحریر ہو وہ مبالغہ، جھوٹ اور عداوت سے پاک ہونی چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمران شاہ ملبندار نے یہ فیصلہ کر کے مضمون لکھا ہے کہ وزیر آغا کی مخالفت ہی کرنی ہے۔ مگر جسے عظمت خدا دے، اسے ظلمت کون دے سکتا ہے۔ عمران شاہ ملبندار کا نام پہلی دفعہ پڑھا ہے کہیں یہ نام فرضی تو نہیں۔" (حوالہ ایضاً - ص ۳۷۳)

کراچی سے جناب جمیل ادیب سید یوں رقم طراز ہیں:

"یہ مضمون (وزیر آغا اور انحرافی تنقید.....) ایک تو اس قدر طویل پھر اندازِ تحریر غیر دلچسپ اور مقصد یہ کہ سراسر غیبت — گویا پیٹ بھر کر طویل ترین غیبت۔ ان (ملبندار صاحب) کا تنقیدی انداز بھی نامناسب ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو برسوں ہم نے نظم و نثر میں پڑھا ہے۔ وہ بہترین شاعری (کرتے) اور مضمون لکھتے رہے ہیں۔ انتہائی منفرد اور جدت لیے ہوئے ہیں۔" (حوالہ ایضاً ص ۳۷۴)

میرا خیال تھا ملبندار صاحب کے مضمون پر جو منفی ردِّ عمل آیا ہے وہ شمارہ ۵۳ تک محدود رہے گا اور ان سے کوئی جواب بن پڑا تو اس بحث کو شاید آگے بڑھنے کا موقع بھی ملے اور ڈاکٹر وزیر آغا کے گراں قدر ادبی کام کی مزید تحقیق و تحسین سامنے آئے۔ ملبندار صاحب شاید اپنی کیچلی میں سمٹ گئے ہیں لیکن وزیر آغا صاحب کی حمایت اور ملبندار صاحب کی تردید کا سلسلہ جاری ہے۔ ارتقاء کے شمارہ ۵۴ میں

Anwour Sadid
172-Sutlej Block
Allama Iqbal Town, Lahore
Ph.042-7820441
Cell: 0334-9719278
Daily "NAWA-E-WAQAT"
Lahore

انور سدید
172-ستلج بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
Ph.042-7820441
روزنامہ "نوائے وقت" لاہور

صفدر صاحب نے اپنے مضمون میں للکارا تھا کہ
"ڈاکٹر وزیر آغا کے امتزاجی تنقید کے تصور کو تسلیم کرنے والے ——— سامنے آئیں اور
میرے پیش کیے گئے دلائل کو غلط ثابت کریں۔ بصورت دیگر اپنے ادبی گناہوں کی معافی مانگیں"
ان کے یہ معنی خارج از مطلب اور لایعنی سوالات کے جوابات کا سلسلہ جاری ہے اور صفدر صاحب کے "ادبی گناہوں" کا تذکرہ برملا ہورہا ہے۔
اب ان کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ اپنی "خطا و توبہ" پر عفو خواہ ہوں۔ اور ممکن ہو تو عابد خورشید صاحب کے نکات کا جواب لکھیں۔
ڈاکٹر عابد سیال صاحب نے طرفہ بن العبد ——— جاہلی عرب شاعری کا شعلۂ مستعجل" کے عنوان سے معلومات افزا مقالہ
لکھا اس کا علم نہیں تھا کہ وہ عربی کے فاضل ہیں۔ دورِ جاہلیت کے عرب شعرا پر بڑا وقیع کام ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے کیا ہے جو پہلے
رسالہ "سویرا" میں قسط وار چھپتا رہا اور اب اس کی ایک کتابی جلد بھی چھپ گئی ہے۔ رضوی صاحب کی تحقیق اس سمت مسلسل آگے بڑھ رہی ہے
اخلاق عاطف صاحب "عجیب مانوس اجنبی تھا" ——— ہم سب کا مخلص دوست اکبر حمیدی ہے جو ۱۲ فروری ۲۰۱۲ کو اس دنیا سے فانی
سے رخصت ہوگئے اور اپنے پیچھے مسودوں کی بڑی تعداد چھوڑ گئے۔ اکبر حمیدی مرحوم کے نواحی مضافاتی قصبے جالندھر نواں کے اپنے والد
اسلاف مشہور اور جو بزرگ ان کے ذوق کے راہنما اور شاعری میں استاد تھے۔ لیکن انہیں حقیقی شہرت لاہور جاکر ملی۔ اخلاق عاطف
اپنی یادوں کو خلوص کے سچے جذبات کے ساتھ پیش کردیا ہے۔ اور آخر نے ایک "فرزند مسعود" کی ادبی خدمات کی تحسین کرکے ان کا حق
ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔
"اب لیب" کا غزل کا حصہ بھرپور نظر آتا ہے۔ مجھے غالب عرفان کی غزل نے بہت متاثر کیا۔ ان دونوں بیشتر شعرا نے فن
حقیقت کو غزل کا اوڑھنا دے رہے ہیں۔ غالب عرفان کے ہاں زیادہ گہرائی نظر آئی۔ ان کی معنویت کا انداز انفرادی ہے۔

جانے کیا ہے وجود و عدم کے بیچ کہیں
کھڑا ہے آنچ کی دیوار دیکھا لپٹ ہوں

پروفیسر ڈاکٹر قاسم جلال نے اپنے پورے عہد کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرکے سوال کیا ہے۔

گو کہ بے دست و پا ہیں ہم مگر کیوں؟
بے ذوقِ عمل جوانیاں ہیں

یاسمین حبیب کی غزل انگلستان کی آزاد فضاؤں میں پرورش پارہی ہے لیکن ان کی غزل کا "مشرقی تشخص" آخری شعر میں
لپٹا ہوا نظر آیا۔

لپٹ کے جاؤں گی میں مغفرت کی مخمل میں
کسی حسین قیامت کے انتظار میں ہوں

ان سے میرا کتابی تعارف محمود ہاشمی صاحب (مصنف "کشمیر اداس ہے") نے کروایا تھا۔ طویل عرصے کے بعد اب "اسالیب" میں نظر آئیں
ان کی غزل نے مجھے عجیب لطف و سرور دیا۔ جاوید اختر چودھری صاحب کی کتاب "شہزادہ" میں بھی یاسمین حبیب کا سرسری سا ذکر پڑھا تھا

شیفون شعر دبیز تر امکانات کے حامل نظر آتے ہیں۔

شفیع ہمدم صاحب کی کتاب "معاصر، ادب اور ادیب" اور صفدر رضا رضی کے رسالہ "گردبان" آپ کے منظوم تجزیاتی نوعیت کے ہیں اور مفاہیم کی معنویت کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آئے۔ آپ کا شمار ان نقادوں میں کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو آدھے خالی "گلاس" کو "آدھا بھرا ہوا گلاس" بتلا کر مثبت تاثر پیدا کرتے ہیں اور زیر مطالعہ کتاب کو حاصل کرنے اور پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

والسلام

آپ کا مخلص

انور

پس نوشت

- اگر مناسب سمجھیں تو مناسب عنوان کے ساتھ اس خط کو الگ لگا دیں
- نقاط کا شمارہ بھجوا سکیں تو شکر گزار ہوں گا۔
- دو ملنے پر اطلاع ضرور دیں۔

انور

آج کا پورا دن آپ کے ساتھ گزرا ہے

Anwar Sadid
172-Sutlej Block
Allama Iqbal Town, Lahore
Ph.042-7820441
Cell: 0334-9719278

Daily "NAWA-E-WAQAT"
Lahore

۱۱ ستمبر ۲۰۱۵

برادرم ذوالفقار احسن صاحب!

سلام مسنون۔

آپ سے پچھلی فون پر میں نے ان نوں کا کہا ہے کہ ان تک
پہ اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ آپ نے گمشدہ ان نوں کو تلاش کر کے
اور زیور طبع سے آراستہ کر کے بے حد اہم کام کیا ہے اردو نوں میں اور ادب جہت
کی ایک فراموش شدہ کڑی کی یاد تازہ کر دی ہے۔ شکریہ ایک ہزار بار شکریہ!
یہ دوست نوازی کی مخلوص مثال ہے۔
ایک چھوٹا سا چیک اس خط کے ساتھ منسلک کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔
ازراہ کرم قبول فرمائیے۔ ملنے پر اطلاع کر دیجیے۔ اس کے لیے مزید شکر گزار ہوں گا
آپ کی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

والسلام آپ کا مخلص

انور

۱۱ ستمبر 2015

cheque No 7538324
MCB Iqbal Town,
Lahore.
for Rs 10,000/-
(Ten Thousand)